www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

April 2007 • No.365

وقت کے استعمال کا بجٹ بنایئے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہ نامہ

الرسالہ

Al-Risala

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300,
Five years Rs. 480
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اپریل 2007

فہرست

کیا قیامت قریب آگئی 2

احیائے اسلام 8

کلچرل ہیریٹج کا پریزرویشن 17

آغازِ کلام 23

ویل للمطففین 34

یہود کی حیثیت 36

تقابلی طریقِ مطالعہ 38

کتاب، ترازو اور لوہا 43

غیر حقیقی ذہن 45

کیا قیامت قریب آگئی

قرآن اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا ابدی نہیں ہے، ایک وقت آئے گا جب کہ وہ ختم کردی جائے گی اور دوسری دنیا بنے گی جو کہ ابدی ہوگی۔ موجودہ دنیا میں ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن کو لے کر دورِ حاضر کے مفکرین یہ اندازہ کرتے رہے ہیں کہ تاریخ کا خاتمہ (end of history) قریب آچکا ہے۔ اب خالص سائنسی سروے کے ذریعے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دنیا واقعۃً اپنے آخری دورِ حیات میں پہنچ چکی ہے۔ اب خالص سائنسی مطالعے کے ذریعے وہ نشانیاں سامنے آئی ہیں جو احادیثِ رسول میں پہلے سے موجود تھیں۔

اقوام متحدہ (UNO) موجودہ دنیا کا سب سے بڑا عالمی ادارہ ہے۔ اقوامِ متحدہ کے تحت، ایک انٹرنیشنل پَینل بنایا گیا۔ اِس پینل میں ڈھائی ہزار سائنس داں شامل کیے گئے۔ اِن سائنس دانوں کا تعلق، دنیا کے 130 ملکوں سے تھا۔ یہ پینل موسمیاتی تبدیلی (climate change) پر رسرچ کے لیے تھا۔ اِس پینل کا صدر دفتر پَیرس میں تھا۔ اِس پینل نے اپنی رسرچ مکمل کرکے اُس کی تفصیلی رپورٹ اقوامِ متحدہ کے حوالے کردی ہے۔ یہ ایک سنسنی خیز رپورٹ ہے، جو میڈیا میں آچکی ہے۔ ہمارے سامنے اِس وقت، نئی دہلی کے انگریزی اخبار 'ٹائمس آف انڈیا' کا شمارہ 3 فروری 2007 ہے۔ اس شمارے میں یہ رپورٹ تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اِس رپورٹ کا ٹائٹل بامعنٰی طور پر یہ ہے— انتباہی نشانیاں (Warning Signs)۔ اِس عنوان میں ایک لفظ کا اضافہ کرکے یوں کہا جاسکتا ہے:

Warning Signs of Doomsday

قرآن میں چودہ سو سال پہلے یہ آیت اتری تھی کہ: **ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت أیدی الناس** (الروم: 41) یعنی خشکی اور سمندر میں انسان کے کیے ہوئے عمل کی بنا پر فساد ظاہر ہوگیا۔ مذکورہ پینل کی رپورٹ اِس قرآنی آیت کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ چناں چہ مذکورہ اخبار میں

اِس رپورٹ کی جو مین ہیڈنگ قائم کی گئی ہے، وہ یہ ہے:

Global warming is man-made

اِس خبر کو لے کر قرآنی آیت کا مفہوم اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

Man-made corruption has spread in the land and in the sea.

مذکورہ رپورٹ میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ صنعتی دَور سے پہلے کے مقابلے میں اب زمین کے اوپر کی فضا بہت گرم ہوگئی ہے۔ اور اِس کا امکان ہے کہ فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار تقریباً دوگُنا ہوجائے۔

اِسی طرح رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بڑھی ہوئی گرمی کی بنا پر قُطبین کی برف (Polar Ice) اور پہاڑوں کے گلیشئر مسلسل پگھل رہے ہیں۔ اِس کی بنا پر سمندر میں پانی کی سطح بلند ہوتی جارہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ قریبی مستقبل میں سمندروں میں پانی کی سطح ایک میٹر تک بلند ہوجائے اور ساحلی مقامات اُس کے تحت ڈوبنے لگیں، کہیں زیادہ اور کہیں کم۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ہماری دنیا میں جو خطرناک تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں، وہ سب ناقابلِ منسوخی نقصان (irreversible damage) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تباہی کے اِس عمل کو اب پیچھے کی طرف لوٹانا ممکن نہیں۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اِن تبدیلیوں کے نتیجے میں زمین پر قحط آئیں گے۔ شدید خشک سالی ہوگی۔ لائف سپورٹ سسٹم شدید طور پر متاثر ہوگا۔ رپورٹ کے مطابق، یہ سب کچھ جو پیش آرہا ہے، وہ انسانی عمل کے نتیجے میں ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ — ہم موجودہ زمین پر آباد تمام انواعِ حیات کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ ہم انسانی نسل کو ناقابلِ تلافی خطرے سے دوچار کررہے ہیں:

We are endangering all species on earth, we are endangering the future of the human race.

حدیث کی کتابوں میں بہت سی روایتیں آئی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت جب قریب آئے گی تو پیشگی طور پر بہت سی نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ مذکورہ رپورٹ میں جو باتیں کہی گئی ہیں، اُن کو دیکھا جائے تو یہ ساری علامتیں اب ظاہر ہوچکی ہیں۔ اِن تمام علامتوں کا بیان یہاں مقصود نہیں

ہے۔ یہاں اُن میں سے صرف بعض علامتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1- حدیث میں آیا ہے کہ: **إذا كان يوم القيامة أُدنيت الشمس من العباد** (مسند احمد، جلد6، صفحہ 3) یعنی جب قیامت کا دن قریب ہوگا تو سورج، انسان کے نزدیک آجائے گا اور اس کی وجہ سے زمین کی گرمی بہت بڑھ جائے گی۔ اِس حدیث میں عین وہی بات ہے جو مذکورہ سروے میں بتائی گئی ہے۔ یہ واضح ہو کہ سورج کے قریب آجانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود سورج کا آتشیں گولا، فاصلے کے اعتبار سے قریب آجائے گا۔ کیوں کہ سورج اگر خود فاصلے کے اعتبار سے قریب آجائے تو زمین پر انسانی زندگی ہی سرے سے ختم ہوجائے گی۔ یہ قربت علامتی معنوں میں ہوگی۔ یعنی خود سورج قریب نہیں آئے گا، بلکہ سورج کی گرمی انسان کے قریب آجائے گی۔ درجۂ حرارت بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔

2- قیامت سے پہلے جب سورج قریب آجائے گا تو انسان کا کیا حال ہوگا، اُس کو حدیث میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **يكون الناس علىٰ قدر أعمالهم فى العَرق، فمنهم مَن يكون إلى كعبيه، ومنهم من يكون إلىٰ رُكبتيه، ومنهم من يكون إلىٰ حَقويه، ومنهم من يلجمهم العرق إلجاماً۔ وأشار رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده الىٰ فيه** (مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث: 5540) یعنی اُس دن لوگ اپنے اعمال کے مطابق، پسینہ پسینہ ہوں گے۔ اُن میں سے کوئی ٹخنے کے بقدر پسینے میں ڈوب جائے گا، اور اُن میں سے کوئی گھٹنے کے بقدر، اور ان میں سے کوئی اپنی کمر کے برابر، اور اُن میں سے کوئی اپنے منھ تک پسینے میں ڈوب جائے گا۔

اس روایت میں 'عــرَق' کا لفظ آیا ہے۔ 'عرق' کے معنٰی عام طور پر پسینے کے لیے جاتے ہیں، لیکن 'عرق' کا اصل مفہوم نچڑا ہوا پانی (squeezed water) ہے۔ پسینے کو 'عرق' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کے پورے جسم سے نچڑ کر نکلتا ہے۔ اِسی طرح انگور سے نچوڑی ہوئی شراب کو 'عرق' کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

اِس روایت میں دراصل علامتی طور پر اِس حقیقت کو بتایا گیا ہے کہ آخری زمانے میں جب

زمین پر سورج کی گرمی زیادہ پڑنے لگے گی تو قطبین پر جمی ہوئی برف اور پہاڑوں کے گلیشئر پگھلنے لگیں گے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوگا کہ سمندروں کے پانی کی سطح بلند ہو جائے گی۔ اِس بنا پر سمندروں کے ساحلی علاقوں میں بستیاں ڈوبنے لگیں گی۔ زمین کی سطحِ مرتفع کے لحاظ سے یہ پانی کہیں زیادہ بلند ہو جائے گا اور کہیں کم۔ سطحِ ارض کی بلندی اور پستی کی نسبت سے زمین کے کچھ حصے کم متاثر ہوں گے، کچھ زیادہ اور کچھ بالکل ڈوب جائیں گے۔

3- اِسی طرح ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک دھواں ظاہر ہوگا۔ اِس سلسلے میں روایت کے الفاظ یہ ہیں: **یملأ الدّخان ما بین المشرق و المغرب**۔ (القرطبی، جلد 16، صفحہ 131) یعنی قیامت سے پہلے ایک دھواں ظاہر ہوگا جو پورب سے پچھّم تک ہر طرف بھر جائے گا۔

اِس روایت میں واضح طور پر اُس جدید ظاہرے کا ذِکر ہے جو جدید صنعت کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، یعنی فضائی کثافت (air pollution)۔ اس قسم کی فضائی کثافت قدیم زمانے میں موجود نہ تھی اور نہ اس کا کوئی تصور پایا جاتا تھا۔ یہ روایت بلاشبہہ اُس جدید ظاہرے کی پیشین گوئی ہے جس کو صنعتی سرگرمیوں کی پیدا کردہ فضائی کثافت کہا جاتا ہے۔

4- اِسی طرح حدیث میں قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی ایک علامت اِس طرح بیان کی گئی ہے: **یوشک الفُرات أن یحسر عن جبلٍ من ذهب، فإذا سمع به الناس سارُوا إلیه، فیقول مَنْ عنده: لئن ترکنا الناس یأخذون منه لیذهبنّ به کُلّه۔ قال: فیقتتلون علیه فیُقتل من کلّ مأة تسعة وتسعون.** (صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعۃ، جلد 18، صفحہ 19)

یعنی عن قریب ایسا ہوگا کہ دریائے فُرات میں سونے کا ایک پہاڑ ظاہر ہوگا۔ جب لوگ اُس کو سنیں گے تو وہ اُس کی طرف چلیں گے۔ اُس کے پاس جو شخص ہوگا، وہ کہے گا کہ — اگر ہم، لوگوں کو اِس میں سے لینے دیں تو وہ سارا کا سارا لے جائیں گے۔ پھر وہ اُس پر قبضہ کرنے کے لیے باہم جنگ کریں گے۔ پھر اُس جنگ میں ننانوے فیصد لوگ قتل کر دیے جائیں گے۔

اِس روایت میں واضح طور پر زمین سے تیل نکلنے کی پیشین گوئی ہے، جس کو موجودہ زمانے میں سیّال سونا (liquid gold) کہا جاتا ہے۔ یہ سیّال سونا دریائے فرات کے علاقہ، بالفاظ دیگر شرقِ اوسط سے بہت بڑی مقدار میں نکلا ہے۔ اِس صنعتی خزانے کے اوپر باقاعدہ لڑائیاں بھی ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور اس سے عظیم تباہی برپا ہوئی ہے۔

5- ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا یبقیٰ علیٰ وجه الأرض بیت مدَر ولا وبَر إلاّ أدخله اللهُ کلمة الإسلام** (مسند احمد، مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث: 42) یعنی زمین کی سطح پر کوئی بھی گھر یا خیمہ باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ اُس کے اندر اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا۔

یہ حدیثِ رسول بھی واضح طور پر قربِ قیامت کی ایک علامت کو بتاتی ہے۔ زمین کی سطح پر بنے ہوئے تمام چھوٹے بڑے گھروں میں 'کلمۂ اسلام' کا داخل ہو جانا، قدیم زمانے میں ممکن ہی نہ تھا۔ یہ صرف موجودہ زمانے میں ممکن ہوا ہے جب کہ مختلف قسم کے ذرائع ابلاغ وجود میں آئے ہیں، جن کو ملٹی میڈیا (multi media) کہا جاتا ہے۔ یہ جدید ملٹی میڈیا، اُس وقت ظہور میں آیا ہے جب کہ دوسری علاماتِ قیامت بالکل ظاہر ہو چکی ہیں۔ اِس لیے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زمین کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں 'کلمۂ اسلام' کا داخل ہونا، قربِ قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

'کلمۂ اسلام' کا ہر گھر میں یہ داخلہ بالفعل واقع ہو چکا ہے۔ آج ٹیلی ویژن اور دوسرے وسائل ابلاغ کے ذریعے عملاً ہر گھر میں اسلام کا چرچا پہنچ چکا ہے۔ آج ہر جگہ اسلام نیوز میں آچکا ہے۔ بروقت اسلام کا یہ چرچا منفی خبر کی صورت میں ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اِس منفی خبر کو مثبت خبر بنا دیا جائے۔ یہ عمل بھی ساری دنیا میں مسلسل جاری ہے۔ اسلام کے منفی چرچا کی بنا پر یہ ہوا ہے کہ ساری دنیا میں لوگوں کے اندر اسلام کو جاننے کے لیے تجسس (curiosity) پیدا ہو چکی ہے۔ لوگ کثرت سے اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ گویا کہ اسلام کا 'کلمۂ' پچاس فیصد ہر گھر میں داخل ہو چکا ہے۔ اور بقیہ پچاس فیصد داخلے کا عمل برابر جاری ہے۔ یقینی ہے کہ جلد ہی یہ عمل اپنی انتہا

کو پہنچ جائے گا۔ یہ واقعہ اِس بات کی علامت ہوگا کہ وہ قیامت اب بالکل قریب آ گئی جس کی خبر خدا کے پیغمبروں نے دی تھی۔

حدیث کے مطالعے سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ قیامت سے پہلے تین 'نفخات' پیش آئیں گے— نفخة الفزع، نفخة الصَّعِق، نفخة القيام۔ نفخة، نَفَخَ کا اسمِ مرّہ ہے۔ نفخ کے معنیٰ پھونکنے کے ہوتے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے— نفخت الريح، یعنی ہوا کا جھونکا اچانک آ گیا۔ اِسی لیے صُور پھونکے جانے کو 'نفخ' کہا گیا ہے۔ یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ حدیث میں جن تین نفخات کا ذکر ہے، وہ یہ ہیں— پہلا، الارمنگ بلو (alarming blow) اور دوسرا، ڈیتھ بلو (death blow) اور تیسرا، رائزنگ بلو (rising blow)۔

راقم الحروف کے اندازے کے مطابق، سائنسی سروے کی مذکورہ رپورٹ جو 'انتباہی نشانیاں' (Warning Signs) کے نام سے چھپی ہے، وہ 'نفخة الفزع' (alarming blow) کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ گویا قربِ قیامت کا پہلا اعلان ہے جو سائنس کی زبان میں کیا گیا ہے۔ دوسرا نفخہ موت کا نفخہ ہوگا جب کہ تمام انسان مرجائیں گے۔ اُس کے بعد تیسرا نفخہ ہوگا جب کہ لوگ دوبارہ زندہ ہوکر خدا کے سامنے میدانِ حشر میں اکھٹا کیے جائیں گے۔

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ: إنّ الساعة لآتية لا ريب فيها (المؤمن: 59) یعنی قیامت یقیناً آنے والی ہے، اُس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ علامات بتاتی ہیں کہ یہ آنے والا وقت بہت قریب آ چکا ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے جب کہ انسان توبہ کرے اور خدا کی رحمت میں پناہ لینے کی طرف دوڑ پڑے۔

احیائے اسلام

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ یبعث علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم)۔ یعنی اللہ ہر سو سال کے سرے پر ایک شخص کو اُٹھائے گا جو دین اسلام کی تجدید کرے گا۔

جدّدَ کے لفظی معنی ہیں، نیا کرنا (to renew)۔ حدیث میں یہ لفظ اس معنیٰ میں آیا ہے کہ اُمت کے اندر جب دین کا تصور گرد آلود ہو جائے تو اُس کو دوبارہ صاف کر کے اُس کی اصل صورت میں نمایاں کیا جائے۔ اس عمل کے لیے حدیث میں دوسرا لفظ احیاء (revival) بھی آیا ہے۔ دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم (سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اُس کے بعد، اور پھر اُس کے بعد) اس حدیث میں تین ادوار کے بارے میں خیر کی شہادت دی گئی ہے۔ علماء نے ان تین دوروں کو 'قرون مشہود لہا بالخیر' قرار دیا ہے، یعنی وہ ادوار جن کے خیر ہونے کی گواہی دی جا چکی ہو۔ ان تین زمانوں سے مراد ہیں — عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین۔

اصل یہ ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں توحید کی دعوت اُٹھی تو اُس وقت جو لوگ اُس میں شامل ہوئے وہ ایسے لوگ تھے جنھوں نے معرفت یا شعوری دریافت کے ذریعے دین حق کو پایا تھا۔ یہ اعلیٰ درجے کے لوگ تھے۔ دوسری نسل میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے، وہ معرفت کے اعتبار سے پہلی نسل کے برابر نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد تیسری نسل میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ فطری طور پر معرفت میں کچھ اور کم ہو چکے تھے۔ اس طرح نسل در نسل یہ ہوتا رہا کہ بعد کے زمانے میں جو لوگ ملت اسلامی کا حصہ بنے اُنھیں اسلام زیادہ تر نسلی تعلق کے ذریعے حاصل ہوا تھا، نہ کہ شعوری دریافت کی بنا پر۔

فطرت کے اسی قانونِ انحطاط (degeneration) کی بنا پر وہ صورتِ حال پیش آتی ہے جس میں اسلام کی تجدید یا ملت کے احیاء کا عمل کیا جائے۔ ہر ایک سو سال، بالفاظ دیگر چند نسلوں کے گذرنے کے بعد، ملت کے اندر اتنا زوال آچکا ہوتا ہے کہ اُس وقت یہ ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی صاحب معرفت شخص اُٹھے جو افرادِ ملت کے رسمی ایمان کو دوبارہ عارفانہ ایمان بنائے۔ جو لوگوں کے تقلیدی اسلام کو دوبارہ تخلیقی اسلام کا درجہ دے۔ جو اسلام کو بعد کے اضافوں اور ملاوٹوں سے پاک کرکے اُس کو اُس کی خالص صورت میں پیش کرے۔

یہ کام کوئی آسان کام نہیں، وہ بے حد مشکل کام ہے۔ زمانہ گذرنے کے بعد ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اصلی اور ابتدائی اسلام کو بھول جاتے ہیں۔ وہ بعد کے مبتدعانہ اسلام ہی کو اصل اسلام سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب بھی کوئی مجدد اٹھتا ہے تو وہ لوگوں کے درمیان فوراً ایک نزاعی شخصیت بن جاتا ہے۔ اُس کا بتایا ہوا دین لوگوں کو اجنبی معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء** (صحیح مسلم، کتاب الایمان) یعنی اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا اور دوبارہ وہ اجنبی ہوجائے گا تو سعادت مندی ہے ایسے اجنبیوں کے لیے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'قرون مشہود لہا بالخیر' کے بعد امت میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اپنے اپنے حالات میں تجدید کا کام کیا۔ مجددین کی کوئی حتمی فہرست بنانا ممکن نہیں۔ تاہم اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند نام یہ ہیں — حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، اشرف علی تھانوی، وغیرہ۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے بارے میں کہا تھا — مجدد کامل تو نہیں، مگر مجددِ معاشرت ضرور ہوں۔ میرے نزدیک یہی معاملہ تمام مجددین امت کا ہے۔ پچھلے زمانوں میں جتنے مجدد اٹھے وہ سب جُزئی معنوں میں مجدد تھے، نہ کہ کُلی معنوں میں۔ میرے مطالعے کے مطابق، مجدد کامل صرف آخری زمانے میں پیدا ہوگا اور غالباً وہ وہی ہے جس کو حدیث میں مہدی کہا گیا ہے۔ مَہدی دراصل

مجدد کامل کا دوسرا نام ہے۔ مزید یہ کہ مَہدی صرف مَہدی ہوگا، وہ ہادی نہیں ہوگا۔ یعنی وہ خود اعلیٰ درجے کی معرفت دین کا حامل ہوگا اور وہ دوسروں کو اس سے باخبر کرے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوگا کہ اُس کے گرد لوگوں کی بھیڑ اکھٹا ہو جائے، وہ سارے عالم میں ہدایت کا انقلاب برپا کردے اور وہ پورے کرۂ ارض پر اسلام کی حکومت قائم کردے۔

جزئی مجدد کا مطلب ناقص مجدد نہیں ہے اور نہ کامل مجدد کا مطلب معیاری مجدد ہے۔ یہ دونوں الفاظ نوعیت کار کو بتانے کے لیے ہیں، نہ کہ امتیازی رتبے کو بتانے کے لیے۔ اصل یہ ہے کہ پچھلے ادوار میں زندگی کا وہ روایتی نظام ٹوٹا نہیں تھا جو مذہبی اور اخلاقی اور روحانی قدروں پر بنا تھا۔ اُس میں صرف جزئی خرابیاں پیدا ہوئی تھیں۔ چنانچہ پچھلے زمانوں میں محدود تجدیدی کام مطلوب تھا جس کو جزئی مجددین نے انجام دیا۔ مگر سائنسی اور صنعتی انقلاب کے بعد دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ صدیوں کا روایتی ڈھانچہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا ہے۔ اس بنا پر بعد کے زمانے میں صرف محدود تجدیدی کام کافی نہیں۔ بعد کے حالات میں ضروری ہوگا کہ ایسا شخص اُٹھے جو انقلابی معنوں میں تجدیدی کام انجام دے۔ یہ فرق درجے کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ ضرورت کے اعتبار سے ہے۔

دور اول کے بعد کی صدیوں میں تجدید کے جو کام ہوئے ہیں اُن کی تفصیل بیان کرنا یہاں مقصود نہیں۔ البتہ اِس معاملے کی وضاحت کے لیے کچھ مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ میرے اندازے کے مطابق، اسلام کی تاریخ میں پہلا انحطاط خلفاء راشدین کے آخری زمانے میں شروع ہوا۔ یہ انحطاط، حدیث کے الفاظ میں، خشوع کے خاتمے کی صورت میں پیدا ہوا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اکثریت کے اندر دین کی اسپرٹ باقی نہ رہی۔ دین اب بھی بظاہر پوری طرح موجود تھا مگر وہ فارم کے اعتبار سے تھا، نہ کہ اسپرٹ کے اعتبار سے۔ یعنی حدیث کے الفاظ میں مسجدیں بظاہر نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، مگر وہ داخلی ہدایت سے خالی تھیں (**مساجدهم عامرة وهي خراب من الهدىٰ**)۔

اس صورت حال کے پیدا ہونے کے بعد اُمت میں بہت سے مصلحین اُٹھے۔ ایک علامتی نام

کے طور پر یہاں حسن بصری کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ حسن بصری اور دوسرے تابعین اور تبع تابعین نے روح اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے کافی کوششیں کیں۔ یہی وہ سلسلۂ اصلاح ہے جس نے بعد کو تصوف یا صوفی ازم کی زیادہ منظّم صورت اختیار کی۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے صوفی ازم اسلام کی اصل روح (ربّانیت) کو زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ اگرچہ یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ صوفیاء اپنی اس کوشش میں کتنا کامیاب ہوئے۔

2۔ عمر بن عبدالعزیز (وفات 101ھ) علم اور اخلاص دونوں میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ اُن کو مجددین امت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُن کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے سیاست میں غیر دینی عناصر کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنے ڈھائی سالہ دورِ حکومت کو دوبارہ خلافتِ راشدہ کے نمونے پر قائم کیا۔ چنانچہ اُنھیں پانچواں خلیفہ راشد کہا جاتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز اور بھی کئی اہم کام کرنا چاہتے تھے، مثلاً احادیثِ رسول کی تدوین، مگر جلد وفات کی بنا پر وہ ایسا نہ کرسکے۔

3۔ بنوامیہ کے دور میں یہ ہوا کہ اسلام کا شورائی نظامِ حکومت باقی نہ رہا۔ وہ ملوکیت کے ڈھانچے میں تبدیل ہوگیا۔ اس تبدیلی کو جائز قرار دینے کے لیے اُنھوں نے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب کو خلیفہ نہیں کہا گیا تھا بلکہ اُن میں سے ہر ایک کو امیر المؤمنین کہا جاتا تھا۔ بنوامیہ نے اپنے زمانے میں پہلی بار خلیفہ کا لفظ اپنے حکمرانوں کے لیے رائج کیا۔ یہ ایک قسم کی سیاسی بدعت تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس سیاسی بدعت کو ختم کرنا چاہا تھا۔ تاہم قلیل مدت کی بنا پر وہ اس میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔

4۔ بنوعباس کے زمانے میں ایک نئی چیز وجود میں آئی۔ وہ یہ کہ عباسی حکمرانوں کے زیر اثر فقہاء نے پوری دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کردیا— دار الاسلام اور دار الحرب۔ اُن کے نزدیک، دار الاسلام وہ ملک تھا جہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو اور دار الحرب وہ ملک تھا جہاں مسلم حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہو اور اس بنا پر وہ امکانی طور پر مسلمانوں سے برسرِ جنگ (potentially at war) کی حیثیت رکھتا ہو۔ دار الاسلام اور دار الحرب کا یہ تصور قرآن اور حدیث

میں موجود نہ تھا۔ وہ صرف اس لیے اختیار کیا گیا کہ وہ اُس وقت کے مسلم حکمرانوں کے توسیعی عزائم سے موافقت رکھتا تھا۔

میرے نزدیک اس کی ضرورت تھی کہ دار الاسلام اور دار الحرب کی اس سیاسی بدعت کے خلاف تجدیدی آواز بلند ہو۔ مگر فقہاء نے اس تقسیم کو عمومی طور پر قبول کر کے اُسے ایک شرعی سند دے دی جو یقینی طور پر درست نہ تھی۔ میرے نزدیک دار الاسلام کے سوا جو ملک ہیں اُن کو دار الانسان یا دار الدعوہ کہا جانا چاہیے، نہ کہ دار الحرب یا دار الکفر۔

5۔ اسی طرح کے انحراف کی ایک مثال وہ ہے جو ترکوں کی عثمانی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں مغربی افکار کے زیر اثر عرب قومیت کی تحریک عرب ملکوں میں پھیلی۔ اُس وقت یہ عرب ممالک ترکی کی عثمانی خلافت کے ماتحت تھے۔ عرب ملکوں میں ان کے خلاف رجحان پیدا ہوا۔ اس رجحان کا آغاز لبنان میں ہوا اور پھر وہ مصر اور دوسرے ملکوں میں پھیل گیا۔ اس تحریک کا نشانہ یہ تھا کہ ہر عرب ملک میں قومی اسٹیٹ بنائی جائے جو وطنی مفاد کے مطابق کام کرے۔

اس تحریک کو کاؤنٹر کرنے کے لیے ترکی کے خلیفہ عبد الحمید ثانی کے زمانے میں الأمة کا تصور اُبھرا۔ اس کے مطابق، تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم تھے۔ مسلمانوں کی قومیت مبنی بر وطن نہ تھی بلکہ وہ اُن کے مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ مذہبی قومیت کا یہ تصور مسلم لیڈروں میں عام طور پر مقبول ہو گیا۔ سید جمال الدین افغانی، امیر شکیب ارسلان، سید قطب، ڈاکٹر اقبال، ابوالکلام آزاد، آیت اللہ خمینی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، محمد علی جناح، وغیرہ سب اس کے حامی بن گئے۔

میرے نزدیک یہ ایک گمراہ کُن نظریہ تھا۔ اس نظریے کے تحت بیش تر ملکوں کے مسلمان خود اپنے ملک میں غیر وفادار بن کر رہ گیے۔ کیوں کہ اس عقیدہ کے مطابق، اُن کی قومیت مبنی بر وطن نہ تھی بلکہ مبنی بر مذہب تھی۔ بدقسمتی سے اس پورے دور میں کوئی قابلِ ذکر مسلم رہنما ایسا نہیں اُٹھا جو اس بے بنیاد نظریے کی غلطی واضح کرے اور مسلمانوں کو اس سے بچائے کہ وہ دور جدید میں خود اپنے وطن میں مشکوک ہو کر رہ جائیں۔ یہ بلاشبہہ ایک تجدیدی کام ہے اور ضروری ہے کہ بلا تاخیر اُس کو انجام دیا جائے۔

6۔ موجودہ زمانے میں ایک اور سنگین نوعیت کا انحراف پیدا ہوا ہے جس کو تہذیبوں کا تصادم (clash of civilizations) کہا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ صلیبی دور ایک نئی صورت میں تاریخ میں دوبارہ واپس آ گیا ہے۔ مسلمانوں کو دوسری قوموں کی سازش اور دشمنی کا سامنا ہے۔ یہ ایک سنگین چیلنج ہے جس کا مقابلہ صرف مسلّح جہاد کے ذریعے ہوسکتا ہے (الجهاد هو الحل الوحيد)۔ اسی ذہن کی ترجمانی ایک عرب شاعر نے اس طرح کی ہے:

هات صلاحَ الدين ثانيةً فينا جدّدى حطّين أو شبهَ حطّينا

اسی ذہن کی نمائندگی فلسطینیوں کے قومی ترانے میں اس طرح کی گئی ہے:

هلم نقاتل هلم نقاتل فإن القتال سبيل الرشاد

میرے نزدیک یہ ایک سنگین نوعیت کا انحراف ہے۔ اس کے نتائج ہر اعتبار سے مسلمانوں کے لیے تباہ کُن ہیں۔ بدقسمتی سے یہاں بھی کوئی قابل ذکر رہنما نہیں اُٹھا جو اس معاملے میں تجدیدی ذمے داری کو انجام دے۔ وہ اس مفروضہ صلیبی جنگ کے تصور کو فکری اعتبار سے ختم کرے اور اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کو مسلّح جہاد کے بجائے پُرامن دعوت کی بنیاد پر قائم کرے۔

7۔ اسلام کا ظہور ساتویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اُس کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام اپنی پوری عظمت کے ساتھ تاریخ میں مارچ کرتا رہا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں صورت حال بدل گئی۔ اب اسلام یا ملت اسلام کا زوال شروع ہوگیا۔ یہ زوال مسلسل بڑھتا رہا اور وہ اب تک جاری ہے۔ پچھلے تقریباً تین سو سال کے درمیان تجدید اور احیاءِ نو کے نام پر بہت بڑی بڑی تحریکیں اُٹھیں۔ کروڑوں مسلمانوں نے ان تحریکوں کا ساتھ دیا۔ اس جدوجہد کے دوران جان و مال کی اتنی زیادہ قربانی دی گئی جو اس سے پہلے ہزار سال کی مدت میں بھی نہیں دی گئی تھی۔ مگر انجام کار کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ کوششیں سب کی سب عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔

8۔ میرے نزدیک اس ناکامی کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے کی

نسبت سے جو تجدیدی کام مطلوب تھا وہ انجام نہ پا سکا۔ حدیث کے الفاظ میں، مجدد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو (أن یکون بصیرا بزمانہ)۔ موجودہ زمانے میں جو مسلم رہنما تجدیدی کام کے لیے اٹھے وہ زمانی بصیرت سے خالی تھے۔ اس لیے وہ کوشش کے باوجود نتیجہ خیز طور پر اس کام کو انجام نہ دے سکے۔

اصل یہ ہے کہ حالیہ تین سو سالہ دور ایک نیا دور تھا جس کو سائنسی دور یا غیر روایتی دور کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے ہزار سالہ دور روایتی دور تھا۔ پچھلے روایتی دور میں تقلیدی قسم کی تجدید کافی تھی۔ چنانچہ پچھلے دور کے مسلم رہنما اپنے اندر کوئی نئی صلاحیت پیدا کیے بغیر تجدید کا کام اُس وقت کے روایتی ڈھانچے میں انجام دے سکتے تھے۔ مگر سائنسی اور صنعتی انقلاب کے بعد دنیا ہر اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اب تجدید کے ساتھ اجتہاد کی ضرورت تھی، وہ بھی کامل اجتہاد، نہ کہ جزئی اجتہاد۔ اب ایک مجتہد مطلق درکار تھا جو قرآن اور سنت سے گہری واقفیت کے ساتھ زمانی تبدیلیوں سے بخوبی واقف ہو۔ زمانہ حاضر میں کسی ایسے صاحب بصیرت مجتہد کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطلوب تجدیدی کام نہ ہو سکا۔ کامل مجدد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمہ گیر سیاسی انقلاب برپا کرے۔ کامل مجدد دراصل وہ ہے جو زمانی تبدیلی کے بعد نئے غیر روایتی حالات میں اسلام کی فکری تشکیل کر سکے۔

9۔ اس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مسلم رہنما اٹھے اور جنھوں نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں اُنھوں نے ہمیشہ حکومت کی تبدیلی کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ مقلّدانہ ذہن کا نتیجہ تھا، نہ کہ مجتہدانہ ذہن کا نتیجہ۔ قدیم زمانے میں زندگی کی تمام سرگرمیوں کا مرکز سیاسی اقتدار ہوتا تھا۔ سیاسی اقتدار کو ہر معاملے میں مرکزی عامل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے سمجھا جاتا تھا کہ سیاسی اقتدار پر قبضہ حاصل کیے بغیر تجدید کا کام مؤثر انداز میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اس روایتی ذہن کی بنا پر یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کہ تجدید کا کام کامل طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی اقتدار پر قبضہ حاصل کیا جائے۔ الاخوان المسلمون کے منشور میں یہ درج ہے کہ: الجهاد منهجنا (جہاد ہمارا طریق کار ہے)۔ یہ اسی

روایتی ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ مسلح جہاد اقتدار کے خلاف ہوتا ہے۔ مسلح جہاد کو اپنا طریقِ کار بتانے کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے سامنے جو نشانہ ہے وہ سیاسی اقتدار ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں یہ نشانہ صرف مقلدانہ ذہن کی علامت ہے، نہ کہ اجتہادی ذہن کی علامت۔

10۔ اصل یہ ہے کہ اس اعتبار سے انسانی تاریخ کے دو دور ہیں— دور حکومت اور دور ادارہ۔ پچھلے زمانے میں جب کہ اقتصادیات کا پورا نظام زراعت پر مبنی ہوتا تھا، تمام اسباب اور ذرائع کا تعلق حکومت سے ہوا کرتا تھا۔ حکومت کے باہر کسی کے لیے کوئی بڑا کام کرنے کے مواقع موجود نہ تھے۔ موجودہ زمانے میں یہ صورت حال بدل گئی ہے۔ اب ایک نئی چیز ظہور میں آئی ہے جس کو ادارہ (institution) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں حکومت کی حیثیت محدود طور پر انتظامیہ (administration) کی ہوگئی ہے۔ اس کے باہر بے شمار شعبے ہیں جن کا تعلق اداروں (institutions) سے ہے اور ان کو حکومت کے بغیر آزادانہ طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

نئے انقلاب نے سیکڑوں قسم کے نئے شعبے پیدا کیے ہیں جن کو ادارہ کی صورت میں بھرپور طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔ ان اداروں نے موجودہ زمانے میں آزاد متوازی سلطنت کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ مثلاً ایجوکیشن، جرنلزم، مالیاتی تنظیمیں، سوشل سروس، پروفیشنل ادارے، میڈیا، مطبوعاتی تنظیمات، اس طرح کی سیکڑوں غیر حکومتی تنظیمات (NGO's) ہیں جن کو اقتدار کے بغیر قائم کرکے تقریباً ہر وہ کام انجام دیا جاسکتا ہے جن کے لیے قدیم زمانے میں سیاسی اقتدار ضروری سمجھا جاتا تھا۔

موجودہ زمانے کے رہنما دور حکومت کے ذہنی نقشہ میں سوچتے رہے۔ وہ دور ادارہ کے ذہنی نقشہ میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی نہ کرسکے۔ اس لیے یہ رہنما حکومتی اقتدار سے ٹکراؤ کرتے رہے اور یک طرفہ تباہی کے سوا وہ کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ دوسری طرف ایسے رہنما بھی ہیں جنھوں نے بظاہر پولٹکل اقتدار حاصل کیا۔ چنانچہ بنگلہ دیش سے لے کر ارٹیریا تک 57 مسلم ممالک ہیں جو مسلم رہنماؤں کی کوشش کے نتیجہ میں وجود میں آئے، مگر 57 مسلم ریاستوں کے قیام کے باوجود احیاءِ اسلام یا احیاءِ ملت کا کام کسی بھی درجے میں انجام نہ پاسکا۔ مسلم ملت

موجودہ زمانے میں بدستور ایک بچھڑا ہوا انسانی قافلہ بنی ہوئی ہے۔

حدیث میں یہ پیشین گوئی آئی ہے کہ آخری زمانے میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کو حدیث میں مہدی کہا گیا ہے، یعنی ہدایت پایا ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مَہدی دورِ آخر کا وہ انسان ہوگا جس کو اوپر مجددِ کامل کہا گیا ہے۔ وہ کوئی عالمی حکومت قائم نہیں کرے گا بلکہ اپنی معرفت اور بصیرت کی بنیاد پر وہ اس قابل ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات میں اسلام کو از سرِ نو دریافت کرے اور عصری انداز میں اس کی فکری تشکیل کر سکے۔ اس مَہدی کی حیثیت ایک رول (role) کی ہے، اُس کی حیثیت پیغمبر کی مانند ایک نامزد عہدہ کی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہدی خود یہ دعویٰ نہیں کرے گا کہ وہ مَہدی ہے۔ البتہ دوسرے لوگ اُس کے کام کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ یہی وہ شخص تھا جس کو حدیث میں مَہدی کہا گیا ہے۔

اس آنے والے انسان کو حدیث میں ہادی کے بجائے مَہدی کہنے میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ ظاہر ہوگا تو ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ بہت بڑی تعداد میں اُس کے گرد اکھٹا ہو جائیں۔ وہ ایک مفکر اور مصلح ہوگا، نہ کہ عالمی سیاسی لیڈر۔ اس کا وجود فکر اسلامی کے اظہار کا ذریعہ بنے گا، نہ کہ اہلِ اسلام کے عمومی سیاسی اقتدار کا ذریعہ۔ وہ نظریاتی معنوں میں عارف باللہ ہوگا، نہ کہ سیاسی معنوں میں کوئی سُلطان۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط و کتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

کلچرل ہیریٹج کا پریزرویشن

کلچرل ہیریٹج (cultural heritage) اُسی چیز کا دوسرا نام ہے جس کو عام طور پر ہسٹاریکل مانیومنٹ (historical monument) کہا جاتا ہے۔ مقامی ریفرنس کے اعتبار سے وہ کلچرل ہیریٹج ہے اور یونیورسل ریفرنس کے اعتبار سے وہ ہسٹاریکل مانومنٹ۔ کلچرل ہیریٹج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کی اہمیت اسلامی ٹریڈیشن میں بھی وہی ہے جو دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن میں مانی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلچرل ہیریٹج کا پریزرویشن (preservation) انسانیت کے اُن عمومی معاملات میں سے ہے جس میں سکولر پوائنٹ آف ویو اور اسلامک پوائنٹ آف ویو کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسلام کے مطابق بھی وہ بلاشبہہ اس قابل ہے کہ اُس کو پریزرو کیا جائے۔ ماضی کے ریکارڈ کو اگر محفوظ نہ رکھا جائے تو مستقبل کی نسلوں کے لیے علم کا ایک معتبر ذریعہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسا تاریخی نقصان ہے جس کی تلافی کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔

اسلام فطرت کا دین ہے۔ ہر وہ چیز جو فطرت اور ریزن کے مطابق قابل لحاظ ہو، وہ یقیناً اسلام میں بھی قابلِ لحاظ قرار پائے گی۔ کسی چیز کا فطری تقاضا ہونا بجائے خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسلام کا تقاضا بھی ہے۔

اسلامی شریعت میں ایک اہم اور مسلمہ اصول یہ ہے کہ: **الأصل فی الاشیاء الإباحة** (چیزوں میں اصل ان کا مباح ہونا ہے) اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو کلچرل ہرٹیج کو پریزرو کرنا یقینی طور پر اسلام میں ایک جائز کام ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سنت میں کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ کلچرل ہرٹیج کو پریزرو نہ کرو۔ اور جب قرآن اور سنت میں اس قسم کی کوئی ممانعت موجود نہیں تو کلچرل ہرٹیج کو پریزرو کرنا اپنے آپ جائز قرار پائے گا۔ اس عمل کو جائز ٹھہرانے کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

تاہم قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلچرل ہیریٹج کی اہمیت کے بارے میں ایسے

حوالے بھی موجود ہیں جو اُس کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے براہِ راست ثبوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں اِس سلسلے میں اسلامی مآخذ سے چند متعلق حوالے درج کئے جاتے ہیں۔

1۔ قرآن میں اس سلسلے کی ایک آیت یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تم میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو (46:4) قرآن کی اس آیت میں 'اثٰرة من علم' کا مطلب (remnant of knowledge) ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں آرکیالوجیکل ریکارڈ یا ہسٹاریکل ریکارڈ کہا جاتا ہے۔

اس قسم کا ریکارڈ ماضی کے واقعات کو جاننے کے لیے نہایت اہم علمی ذریعہ ہے۔ ایسی حالت میں ماضی کے اس ریکارڈ کو محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، علمی نقطۂ نظر سے بھی اور اسلامی نقطۂ نظر سے بھی۔

2۔ کلچرل ریکارڈ یا ہسٹاریکل ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کی ایک عملی مثال قرآن میں وہ ہے جو فرعون کے تذکرہ کے ذیل میں آئی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موسیٰ کا ہم عصر فرعون جب غرق ہو کر مرا تو اللہ تعالیٰ نے اُس سے فرمایا کہ — آج ہم تمھارے بدن کو محفوظ رکھیں گے تاکہ وہ تمھارے بعد والوں کے لیے نشانی ہو (10:92)

جیسا کہ معلوم ہے، مذکورہ فرعون کا جسم مصری رواج کے مطابق، مرنے کے بعد مومیائی کر کے ایک اہرام میں رکھ دیا گیا تھا۔ یہ بلاشبہہ قدیم مصری کلچر کا ایک حصہ تھا۔ مصری کلچر کا یہ حصہ خود خدا کے منصوبے کے تحت محفوظ رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں اُس کو مصر کے ایک اہرام سے نکالا گیا۔ اور کاربن ڈیٹنگ کے جدید طریقہ کو اَپلائی کر کے یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں غرق ہوا تھا۔ فرعون کا یہ محفوظ جسم قاہرہ کے میوزیم میں قرآن کی مذکورہ آیت کی ایک شہادت کے طور پر آج بھی رکھا ہوا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، فرعون ایک مشرک بادشاہ تھا۔ اس کے باوجود اللہ کی مرضی یہ ہوئی کہ اُس کے جسم کو محفوظ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلچرل ہسٹری کی نہ صرف عام چیزیں بلکہ مشرک بادشاہ کا جسم بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ بامیان میں واقع بودھ

کے دو ہزار سالہ مجسموں کو محفوظ رکھنا اسلام میں بھی اُسی طرح مطلوب ہے جس طرح دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن میں مطلوب ہے یا ہوسکتا ہے۔

3۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ اُن کے یہاں ایک وراثتی تابوت (صندوق) موجود تھا جو نسل در نسل اُن کے یہاں ذریعۂ سکون کے طور پر محفوظ رہا۔ اس تابوت میں آل موسیٰ اور آلِ ہارون کے تبرکات محفوظ کئے گئے تھے۔ گویا یہ عین وہی چیز تھی جس کو موجودہ زمانے میں کلچرل ہیریٹج کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وراثتی تابوت کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ ایک موقع پر اُس کو فرشتے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے۔ (2:248)

میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل ہیریٹج کو محفوظ کرنے کی یہ ایک براہِ راست مثال قرآن میں موجود ہے۔ اس سے کلچرل ہیریٹج کی اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ایسی چیز کو نسل در نسل محفوظ رکھنا شریعتِ الٰہی کے خلاف نہیں۔

4۔ قرآن میں مومن کی ایک صفت 'السائح' بتائی گئی ہے (9:112) یعنی سیاحت کر کے زمین کے مختلف مقامات پر جانا اور پچھلی قوموں کے چھوڑے ہوئے آثار و مساکن کو دیکھ کر اُن سے نصیحت لینا (28:58)۔ قرآن میں بتکرار یہ آیت آئی ہے: **قل سیروا فی الأرض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین** (6:11)

اس کے مطابق، اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ماضی کے تاریخی آثار کو اُس کی ابتدائی شکل میں محفوظ رکھا جائے تاکہ دیکھنے والے لوگ اُن سے سبق لے سکیں۔ تاریخی آثار کو محفوظ نہ رکھنے کی صورت میں اسلام کا یہ سیاحتی مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

5۔ کلچر ہمیشہ ایک طبقہ یا ایک کمیونٹی کی وراثت ہوتا ہے۔ ہر کمیونٹی کو یہ مطلق رائٹ حاصل ہے کہ وہ اپنے کلچر کا تحفظ کرے۔ کلچر کے معاملے میں نہیں دیکھا جائے گا کہ وہ اسلام کے موافق ہے یا اس کے خلاف۔ جب بھی کوئی کمیونٹی کسی کلچر کو اپنا کلچر سمجھے اور اس کو محفوظ رکھنا چاہے تو یہ حق اس کو دیا جائے گا۔ یہ حق جس طرح سیکولرزم میں تسلیم کیا گیا ہے اس طرح وہ اسلام میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کے خلیفۂ ثانی عمر فاروق کی خلافت کے زمانے میں یروشلم (ایلیا) فتح ہوا تو خود عمر فاروق مدینہ سے سفر کر کے یروشلم گئے۔ اس وقت اسلامی خلافت اور مسیحی فرقہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا، اُس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا گیا کہ مسیحی چرچوں میں جو چیزیں ہیں وہ محفوظ رہیں گی۔ مثلاً مریم اور مسیح کے بت، وہ مقدس لکڑی جس پر مسیحی عقیدہ کے مطابق، حضرت مسیح کو سولی دی گئی، وغیرہ (تاریخ الطبری) اس قسم کی چیزیں مسیحی کلچر کا حصہ تھیں مگر معاہدہ میں یہ لکھا گیا کہ مسیحی فرقہ کو یہ حق ہوگا کہ ان کے چرچ ڈھائے نہ جائیں اور ان کے کلچرل ہر ٹچ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ وہ جس طرح چاہیں اپنے کلچر کی حفاظت کریں۔

خلیفۂ ثانی کے اس عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے کلچر کا حصہ سمجھتی ہے اُس کو وہ محفوظ رکھے، خواہ وہ مسلم حکومت کے اندر ہو یا مسلم حکومت کے باہر۔ کسی حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی گروہ کے کلچر کے معاملے میں دخل دے۔ کلچر کے تحفظ کا معاملہ حکومتی مداخلت سے آزاد معاملہ ہے۔

6۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ بین اقوامی اہمیت کی چیزوں میں اسلام کا نارم (norm) بھی وہی ہوگا جو دوسری قوموں کا متفقہ نارم ہو۔ انٹرنیشنل نارم کے معاملے میں اسلام کا یہ اصول پیغمبر اسلام کے بعض واقعات سے مستنبط ہوتا ہے۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں یمن کے ایک شخص مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اُس نے دو آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک وفد رسول اللہ کے پاس مدینہ بھیجا اور یہ کہلوایا کہ آپ میری نبوت کو قبول کریں۔ پیغمبر اسلام نے اُن دو آدمیوں سے پوچھا کہ مسیلمہ کے معاملے میں تمھاری اپنی رائے کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ ہم بھی اُس کو اُس کے دعویٰ کے مطابق، نبی مانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ رواج نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں ضرور تم دونوں کو قتل کر دیتا (سیرت ابن ہشام)

پیغمبر اسلام کے اس ارشاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز انٹرنیشنل طور پر تسلیم

کرلی جائے تو اسلام میں بھی اُس کو تسلیم کیا جائے گا۔ اس اصول کی روشنی میں کلچرل ہیریٹج کو محفوظ کرنا اسلام میں بھی اُتنا ہی اہم ہے جتنا کہ وہ دوسری قوموں کے نزدیک اہم ہے۔ جدید دنیا میں کلچرل ہیریٹج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کو نہایت اہمیت کے ساتھ محفوظ کیا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی بلاشبہہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ اس معاملے میں دوسروں سے الگ اسلام کا کوئی طریقہ نہیں۔

پیغمبر اسلام مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کھجور کے درخت نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ ہجرت کرکے مدینہ آئے۔ یہاں کھجوروں کے باغ ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ ٹاؤن سے باہر ایک باغ کے پاس سے گزرے۔ یہاں کچھ لوگ کھجور کے درخت پر چڑھ کر اپنے ہاتھوں سے ہینڈ پالی نیشن (hand-pollination) کا کام کررہے تھے۔ آپ نے انھیں ایسا کرنے سے منع کردیا۔

اگلے سال کھجور کی فصل کم آئی۔ آپ نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ آپ نے پالی نیشن (تأبیر نخل) سے منع کردیا تھا جب کہ اُسی سے کھجور میں اچھی فصل آتی ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم جو کرتے تھے اُس کو کرو، کیوں کہ تم اپنی دنیا کے معاملے میں زیادہ جانتے ہو (أنتم اعلم بأمور دنیاکم)

پیغمبر کے اس قول سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے عقیدہ اور امور دنیا کا فرق۔ اسلام کے مطابق، زندگی کے وہ معاملات جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے امور دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو عقیدہ کے تابع نہیں رکھا جائے گا، بلکہ ایسے موضوعات علمی ریسرچ کے تابع ہوں گے۔ ان میں وہی چیز درست قرار پائے گی جو علمی ریسرچ سے درست قرار پاتی ہو۔ ایگری کلچر اور ہارٹی کلچر سے لے کر انجینئرنگ اور ہسٹری کے شعبے تک سب اس میں شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل ہرٹیج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کے پریزرویشن کا معاملہ بھی انھیں چیزوں میں سے ہے جو علمی ریسرچ کے تابع ہیں، نہ کہ عقیدہ (faith) کے تابع۔

خلاصہ یہ کہ اصولی ہدایات اور عملی نظائر دونوں اعتبار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلچرل ہیریٹج یا ہسٹاریکل مانومنٹ کے پریزرویشن کے معاملے میں اسلام کی رائے بھی وہی ہے جو دوسرے ٹریڈیشن یا

ڈسپلن کی ہے۔ بالفرض اگر کسی مسلم ملک میں کوئی مانیومنٹ ایسا ہو جس کو کسی مصلحت کی بنا پر ملک کے اندر رکھنا مناسب نہ ہو تو ایسی حالت میں اُس کو تباہ نہیں کیا جائے گا بلکہ خواہش مند قوموں اور ملکوں کو اُسے ایکسپورٹ کر دیا جائے گا تاکہ وہ اُس کو اپنے میوزیم میں محفوظ کر سکیں۔

افغانستان (بامیان) میں گوتم بدھ کے مجسموں کو جس طرح توڑا گیا وہ ہرگز اسلام نہ تھا، وہ غلو (ایکسٹریمزم) تھا، اور قرآن اور حدیث کے مطابق، غلو (ایکسٹریمزم) اسلام میں نہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب 'ہند-پاک ڈائری'، صفحہ: 247)

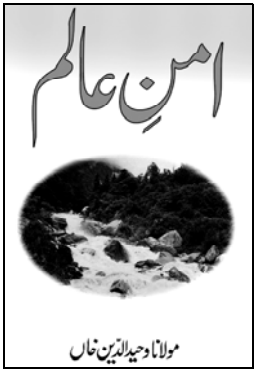

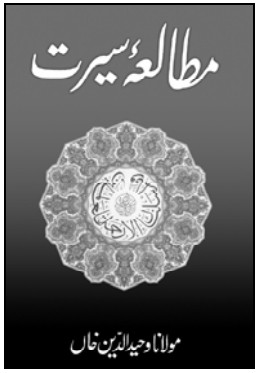

آغازِ کلام

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ وہ اپنی اصل عربی زبان میں پوری طرح محفوظ ہے۔ ایسی ایک کتاب کا ترجمہ کبھی اصل کتاب کا بدل نہیں بن سکتا۔ ترجمۂ قرآن کا مقصد صرف تقریبِ فہم ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص عربی زبان نہ جانتا ہو، وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔ قرآن، ایک غیر عربی داں کے لیے بھی ایک قابلِ فہم کتاب ہے۔ قرآن بظاہر عربی زبان میں ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت کی زبان میں ہے، یعنی وہ زبان جس میں خدا نے تخلیق کے وقت سارے انسانوں سے براہِ راست خطاب کیا تھا۔ یہ خطاب ہر عورت اور مرد کے اندر غیر شعوری طور پر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس لیے قرآن ہر انسان کے لیے ایک قابلِ فہم کتاب ہے، کسی کے لیے شعوری طور پر اور کسی کے لیے غیر شعوری طور پر۔

اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **بل هُو آيٰت بيّنٰت فی صدور الذين أوتو العلم** (العنکبوت:49) یعنی یہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں اُن لوگوں کے سینوں میں جن کو علم ہوا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جس حقیقتِ ربّانی کو شعور کی زبان میں بتا رہا ہے، وہ غیر شعوری زبان میں پہلے سے انسان کے اندر موجود ہے۔ قرآن کا پیغام انسان کے لیے کوئی اجنبی پیغام نہیں، وہ اُسی معرفت کا ایک لفظی اظہار ہے جس سے انسان فطرت کی سطح پر پہلے سے آشنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو انسان بعد کے زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں، وہ سب ابتدائی طور پر تخلیقِ آدم کے وقت ہی پیدا کر دیے گیے تھے۔ اُس وقت خدا نے ان انسانی روحوں سے براہِ راست خطاب کیا۔ اِس معاملے کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھیرایا خود اُن کے اوپر ''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں''۔ انھوں نے کہا: ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اِس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اِس کی خبر نہ تھی''۔ (الاعراف: 172)

خدااور بندے کے درمیان ایک اور مکالمے کا ذکر قرآن میں اِس طرح آیا ہے:

''ہم نے امانت (اختیاری عمل) کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اُس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گیے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا''۔ (الاحزاب: 72)

اِن دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءِ تخلیق میں خدا نے تمام انسانوں کو براہِ راست طور پر خطاب کیا تھا۔ اِس خطاب میں جو بات کہی گئی تھی، وہ تمام انسانوں کے لاشعور میں محفوظ کر دی گئی۔ گویا کہ خدا کے جس کلام کو انسان، قرآن کی صورت میں پڑھ رہا ہے، اس سے پہلے براہِ راست خدائی خطاب کے تحت وہ اُس کو سُن چکا ہے اور سمجھ چکا ہے۔ قرآن، انسان کے لیے ایک معلوم بات کو جاننا ہے، نہ کہ کسی نامعلوم بات کو اچانک سُننا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن انسانی ذہن کی اَن فولڈنگ (unfolding) ہے۔

اس بات کو سامنے رکھا جائے تو یہ جاننا مشکل نہیں کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے قرآن کا ترجمہ بھی ایک کافی ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس آدمی کی فطرت زندہ ہو، جس نے اپنے آپ کو بعد کی کنڈیشننگ سے بچایا ہو، وہ جب قرآن کا ترجمہ پڑھے گا تو اس کے ذہن کے وہ خانے کھُل جائیں گے جہاں خدا کا خطابِ اوّل پہلے سے محفوظ ہے۔ عہدِ اَلست اگر خدا کا خطابِ اوّل ہے تو قرآن خدا کا خطابِ ثانی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے تصدیق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی آدمی اگر عربی زبان نہ جانتا ہو، یا کم جانتا ہو اور وہ صرف ترجمۂ قرآن پڑھنے کی پوزیشن میں ہو تو اُس کو فہمِ قرآن کے بارے میں مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے — قرآن کا یہ تصورِ انسان موجودہ زمانے میں ایک سائنسی حقیقت بن چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں جنیٹک کوڈ کی سائنس اور انتھراپالوجی کا مطالعہ، دونوں اِس قرآنی نقطۂ نظر کی کامل تائید کرتے ہیں۔

ہر کتاب کا ایک موضوع (subject) ہوتا ہے۔ قرآن کا موضوع یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan of God) سے انسان کو آگاہ کیا جائے، یعنی انسان کو یہ بتایا جائے کہ خدا نے یہ دنیا

کس لیے بنائی ہے۔ انسان کو زمین پر بسانے کا مقصد کیا ہے۔ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں انسان سے کیا مطلوب ہے، اور موت کے بعد کے دورِ حیات میں انسان کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ انسان ایک ابدی مخلوق ہے۔ اس کا سفرِ حیات موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ قرآن اِس پورے سفرِ حیات کے لیے ایک رہنما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کو اِس حقیقت سے باخبر کرنا، یہی قرآن کا مقصد ہے اور یہی قرآن کا موضوعِ کلام۔

خدا نے انسان کو ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کے عرصۂ حیات (life span) کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کا بہت تھوڑا حصہ قبل از موت دور میں رکھا اور اس کا زیادہ بڑا حصہ بعد از موت دَور میں رکھ دیا۔ موت سے پہلے کا جو دَور ہے، وہ ٹسٹ کا دور ہے اور موت کے کا جو دور ہے، وہ ٹسٹ کے مطابق، اچھا یا بُرا انجام پانے کا دور۔ قرآن، زندگی کی اِسی حقیقت کے لیے ایک تعارفی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ پیدائشی طور پر ایک متلاشی (seeker) ہے۔ ہر انسان کے دماغ میں یہ سوال چھپا ہوا ہے کہ میں کون ہوں، میرا مقصدِ حیات کیا ہے، زندگی کی حقیقت کیا ہے اور موت کی حقیقت کیا، اِس دنیا میں آدمی کی کامیابی اور ناکامی کا راز کیا ہے، وغیرہ۔

قرآن کے مطابق، اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور بعد کی دنیا امتحان کا انجام پانے کی جگہ۔ قبل از موت دورِ حیات میں انسان کو جو کچھ ملا ہے، وہ سب امتحان کا پرچہ ہے۔ بعد از موت دورِ حیات میں انسان کو وہ چیز ملے گی جس کا استحقاق اس نے موجودہ دنیا میں پیدا کیا تھا۔ اِس دنیا میں آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کو سمجھے اور اس کے مطابق، اپنے زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

ایک عام آدمی جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ قرآن بظاہر متفرق بیانات (fragmentary statements) کا مجموعہ ہے۔ یہ احساس بظاہر خلافِ واقعہ نہیں۔ مگر قرآن کا یہ انداز کسی کمی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ وہ عَین منصوبۂ قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن موجودہ حالت میں

جیسا ہے، ویسا ہی اُس کو ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن خدائی تنبیہ کی ایک کتاب ہے۔ وہ اَسباق اور نصیحت کا ایک مجموعہ ہے۔ قرآن، عام طرزِ تصنیف کے مطابق تیار نہیں ہوا۔ زیادہ صحیح طور پر قرآن ایک بُک آف وزڈم ہے۔ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ قرآن کو پڑھنے والا اگر قرآن کا صرف ایک صفحہ پڑھے، یا اُس کا صرف ایک جملہ سُنے تب بھی اُس کو اُس میں ایک میسیج مل جائے۔

قرآن ایک اعتبار سے مُنعم کی طرف سے انعام کی یاد دہانی ہے۔ خدا نے انسان کو استثنائی اور اوصاف کے ساتھ پیدا کیا۔ پھر اُس کو زمین جیسے سیارے پر بسایا، جہاں انسان کے لیے ہر قسم کا لائف سپورٹ سسٹم موجود ہے۔ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ انسان، فطرت کے اِن انعامات سے استفادہ کرتے ہوئے مُنعم کو یاد رکھے۔ وہ انعامات کے خالق کو اکنالج کرے۔ انعامات کو استعمال کرتے ہوئے مُنعم کو اکنالج کرنا اور اُس کے تقاضے پورے کرنا، یہی ابدی جنت کا سرٹفکٹ ہے۔ اور انعامات کو استعمال کرتے ہوئے مُنعم کو فراموش کر دینا، آدمی کو جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔ قرآن دراصل اِسی سب سے بڑی حقیقت کی یاد دہانی ہے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کو پانے کے لیے صحبت ضروری ہے۔ ان کے نزدیک کسی صاحبِ کمال کی صحبت سے پُراسرار طور پر قرآن کے معانی آدمی کے اوپر کھُل جاتے ہیں۔ یہ قرآن اور انسان دونوں کی تصغیر ہے۔ قرآن، انسان کی عقل کو خطاب کرتا ہے۔ اور عقل انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ عقل کی سطح پر قرآن کو پانا ہی قرآن کو پانا ہے۔ جو لوگ عقل سے کم تر کسی سطح پر قرآن کو پائیں، انھوں نے قرآن کو پایا ہی نہیں۔ عقل کی سطح پر پانے والے کے لیے قرآن اُس کی فکری دریافت بن جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، جو لوگ قرآن کو عقل کی سطح پر نہ پائیں، وہ اُس کو صرف قومی روایت کے طور پر پائیں گے۔ اور قومی روایت کے طور پر پانا، قرآن کو صرف کم تر سطح پر پانے کے ہم معنیٰ ہے۔

قرآن کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ صرف اصولی اور بنیادی باتوں کو بیان کرتا ہے۔ وہ اِن باتوں کو مؤکّد (emphasize) کرنے کے لیے اُنھیں بتکرار بیان کرتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں جُزئی

باتیں یا ظاہری فارم سے متعلق باتیں قرآن میں اتنی کم ہیں گویا کہ وہ موجود ہی نہیں۔ اِس سے قرآن کی اسکیم کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن کے نزدیک فارم کی اہمیت تمام تر سکنڈری ہے۔ قرآن کے نزدیک ساری اہمیت اُن چیزوں کی ہے جن کو خدائی دین میں اصولی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن کا یہ پہلو اتنا زیادہ واضح ہے کہ کوئی بھی شخص جو قرآن کو پڑھے، وہ اس کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اصل یہ ہے کہ اسلامی شخصیت کی تعمیر میں ساری اہمیت داخلی اسپرٹ کی ہے۔ داخلی اسپرٹ اگر پیدا ہو جائے تو فارم اپنے آپ پیدا ہو جائے گا۔ ظاہری فارم کبھی بھی داخلی اسپرٹ کو پیدا کرنے والا نہیں بن سکتا۔ البتہ داخلی اسپرٹ اگر بھرپور طور پر پیدا ہو جائے تو ظاہری فارم لازماً پیدا ہو کر رہتا ہے۔ اِس لیے قرآن کی ساری کوشش یہ ہے کہ آدمی کے اندر ذہنی انقلاب لایا جائے۔ ذہنی انقلاب کے لیے قرآن میں معرفت، یا عرفانِ حق (المائدہ: 83) کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کا سارا زور اِس پر ہے کہ آدمی معرفت کے درجے میں سچائی کو پائے۔ ایمان باللہ وہی ہے جو معرفت کی سطح پر کسی آدمی کو حاصل ہو۔ معرفت نہیں تو ایمان بھی نہیں۔

آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ اُس میں بار بار اِس قسم کے بیانات پائیں گے کہ یہ خدا کا اتارا ہوا کلام (Word of God) ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات ہے، لیکن جب اس کو تقابلی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ دنیا میں بہت سی کتابیں ہیں جن کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ مقدس کتابیں ہیں۔ لیکن قرآن کے سوا کسی بھی مقدس مذہبی کتاب میں آپ کو یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ اِس قسم کا بیان استثنائی طور پر صرف قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں اِس قسم کا بیان ہونا، اُس کے قاری کو ایک نقطۂ آغاز دیتا ہے۔ وہ اس کا مطالعہ ایک استثنائی کتاب کے طور پر کرتا ہے، نہ کہ عام انسانی کتاب کے طور پر۔

اِسی طرح قرآن میں بار بار اِس طرح کا اندازِ خطاب ملتا ہے — اے انسان، یہ تیرا رب ہے جو تجھ سے خطاب کر رہا ہے۔ تو اِس خطاب کو سُن اور اس کا اتباع کرنا۔ یہ اندازِ خطاب بھی انتہائی استثنائی ہے۔ کسی بھی دوسری کتاب میں اِس قسم کا براہِ راست خدائی خطاب موجود نہیں۔ یہ طرزِ خطاب انسان کو

غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ میرا خدا براہِ راست طور پر مجھ کو خطاب کر رہا ہے۔ یہ احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ قرآن کے بیان کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ لے۔ وہ اُس کے ساتھ عام انسانی کتاب جیسا معاملہ نہ کرے۔

قرآن کا اسلوبِ بیان بھی ایک منفرد اسلوبِ بیان ہے۔ عام انسانی کتابوں کا طریقہ یہ ہے کہ اُس میں چیزیں تصنیفی ترتیب کے ساتھ درج ہوتی ہیں۔ اُس میں اے سے زیڈ تک سلسلہ وار ترتیب کی صورت میں چیزوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں اِس قسم کا اسلوب موجود نہیں۔ عام انسان کو بظاہر قرآن ایک غیر مرتب کلام معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایک انتہائی مربوط اور مرتب کلام نظر آئے گا۔

قرآن کے اسلوبِ کلام کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُس کا اسلوب ایک شاہانہ اسلوب ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کا مصنف ایک ایسے برتر مقام پر ہے جہاں سے وہ ساری انسانیت کو دیکھ رہا ہے۔ ساری انسانیت اُس کا کنسرن ہے۔ وہ اپنے مقامِ عظمت سے پوری انسانیت کو خطاب کر رہا ہے۔ البتہ اِس خطاب کے دوران اُس کا رخ کبھی ایک گروہ کی طرف مُڑ جاتا ہے اور کبھی دوسرے گروہ کی طرف۔

قرآن کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اُس کا قاری کسی بھی لمحہ اُس کے مصنف سے کنسلٹ کرسکتا ہے۔ قرآن کا مصنف خدا ہے۔ وہ ایک زندہ خدا ہے۔ وہ سارے انسانوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ براہِ راست طور پر ہر انسان کی بات کو سنتا ہے اور اُس کا جواب دیتا ہے۔ اِس لیے قرآن کے قاری کے لیے ہر لمحہ یہ ممکن ہے کہ وہ خدا سے ربط قائم کرسکے۔ وہ خدا سے پوچھے اور خدا سے اپنے سوال کا جواب پالے۔

جو لوگ صرف میڈیا کے ذریعے قرآن کو جانتے ہیں، وہ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ قرآن جہاد کی کتاب ہے، اور جہاد ان کے نزدیک نام ہے تشدد کے ذریعے اپنے مقصد کو حاصل کرنا۔ مگر یہ صرف غلط فہمی کی بات ہے۔ جو آدمی بھی قرآن کو براہِ راست پڑھے، اُس کو یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی کہ قرآن کا تشدد سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن مکمل طور پر کتابِ امن ہے، نہ کہ کتابِ تشدّد۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو جہاد کہا جاتا۔ لیکن جہاد پُر امن کوشش کا نام ہے، نہ کہ کسی قسم کے متشددانہ عمل کا۔ قرآن کا تصورِ جہاد قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: **وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً**۔ یعنی قرآن کے ذریعے اُن کے ساتھ جہاد کرو، بڑا جہاد:

Do great Jihad with the help of the Quran. (25:52)

قرآن کی اِس آیت میں قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کوئی ہتھیار نہیں، قرآن ایک نظریاتی کتاب ہے۔ قرآن، خدائی آئڈیالوجی کا تعارف ہے۔ اِس سے قرآن کا تصورِ جہاد واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق، جہاد دراصل پُر امن نظریاتی جدوجہد (ideological struggle) کا نام ہے۔ اِس نظریاتی جدوجہد کا نشانہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کا پیغام لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے: **وقل لھم فی أنفسھم قولاً بلیغاً**:

And speak to them a word to reach their very soul. (4:63)

اِس آیت کے مطابق، قرآن کا مطلوب قول وہ ہے جو 'قولِ بلیغ' ہو، یعنی ایسا کلام جو لوگوں کے مائنڈ کو ایڈریس کرے۔ جو لوگوں کو مطمئن کرنے والا ہو۔ جس کے ذریعے لوگوں کو قرآن کی صداقت پر یقین پیدا ہو۔ جس کے ذریعے لوگوں کے اندر فکری انقلاب برپا ہو جائے۔ یہ قرآن کا مشن ہے۔ اور اِس قسم کا مشن صرف دلائل کے ذریعے انجام دیا جا سکتا ہے۔ تشدد یا کسی بھی مسلح کارروائی کے ذریعے اِس نشانے کو پانا ممکن نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں کچھ ایسی آیتیں ہیں جو قتال (war) کی اجازت دیتی ہیں۔ لیکن یہ آیتیں صرف جنگی حالات کے لیے ہیں۔ وہ صرف حملے کے وقت دفاع کے معنیٰ میں ہیں۔ دفاع کے سوا کوئی جنگ اسلام میں جائز نہیں۔ یہ دفاع بھی صرف ایک قائم شدہ ریاست (established state) کر سکتی ہے۔ اسٹیٹ کے سوا کسی بھی فرد، یا تنظیم کو جہاد چھیڑنے کی اجازت نہیں۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے ایک اہم بات یہ ہے کہ قرآن کوئی قانونی کتاب نہیں ہے، قرآن ایک

دعوتی کتاب ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اسلوبِ کلام قانونی نہیں ہے، بلکہ دعوتی ہے۔ قانون کی زبان تعیّنات کی زبان ہوتی ہے۔ قانونی تحریر میں چیزیں لفظی طور پر مطلوب ہوتی ہیں۔ جب کہ دعوتی تحریر کا معاملہ ایسا نہیں۔ دعوتی تحریر میں اِس کے معانی پر زور ہوتا ہے۔ دعوتی کتاب میں الفاظ کی حیثیت صرف ذریعے کی ہوجاتی ہے۔ جب کہ قانونی کتاب میں الفاظ خود مقصود بالذات بن جاتے ہیں۔

اِس کا ایک پہلو یہ ہے کہ دعوتی تحریر میں تاکید کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شدت کے اسلوب کو اختیار کیا جاتا ہے۔ دعوتی تحریر میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو بظاہر نہایت سخت معلوم ہوتے ہیں، مگر دعوتی کلام میں یہ سختی بَر بناءِ حکمت ہوتی ہے۔ ایسے کسی کلام میں شدت کو دیکھ کر اُس کو قانونی شدت کے معنیٰ میں لینا، سرتاسر نادانی کی بات ہوگی۔ اِسی حکمت کا یہ نتیجہ ہے کہ دعوتی کلام میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُس میں ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو قانونی اسلوب کے اعتبار سے نہایت سخت معلوم ہوتی ہے، لیکن دعوتی اسلوب کے اعتبار سے وہ صرف جھنجھوڑنے کے لیے ہوتی ہے، وہ صرف اِس لیے ہوتی ہے کہ آدمی کی فطرت کو جگایا جائے۔ اس کے اندر چھپے ہوئے احساسات کو متحرک کیا جائے۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

1- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بدر (2 ہجری) کی لڑائی پیش آئی۔ یہ لڑائی آپ نے دفاع کے طور پر کی تھی۔ اِس لڑائی میں آپ کو جیت ہوئی۔ جنگ کے بعد آپ نے مخالفین کے ستر آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ اِس کے بعد یہ لوگ اَسیرانِ جنگ کی حیثیت سے مدینہ لائے گیے۔ اِس واقعے پر قرآن میں یہ آیت اُتری: **ماکان لنبیّ أن یکون له أسریٰ حتی یثخن فی الأرض** (الانفال: 67) یعنی کسی نبی کے لیے لائق نہیں کہ اُس کے پاس قیدی ہوں، جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خوں ریزی نہ کرلے۔

اِس آیت کے الفاظ کو اگر قانونی مفہوم میں لیا جائے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسیرانِ جنگ کو لازماً قتل کیا جانا چاہیے۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ اسیرانِ جنگ بوقتِ نزولِ آیت پوری طرح رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضۂ اختیار میں تھے۔ ایسی حالت میں اگر یہ آیت قانون کی زبان میں ہوتی تو اُس میں اِس قسم کے الفاظ ہونے چاہیے تھے کہ — جن ستر آدمیوں کو تم میدانِ جنگ سے گرفتار کر کے مدینہ لائے ہو، وہ سب کے سب اپنے جرم کی بنا پر گردن زدنی ہیں۔ اس لیے فوراً اُنھیں قتل کر کے ان کا خاتمہ کر دو۔ مگر نہ قرآن میں ایسی آیت اتری اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس آیت کو قانونی آیت سمجھ کر اُس کی لفظی تعمیل کی۔

اِس واقعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اپنے ظاہری الفاظ کے اعتبار سے مطلوب نہ تھی، بلکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطلوب تھی، یہ شدتِ کلام کا معاملہ تھا جو اس لیے تھا کہ اسیرانِ جنگ کے اندر اپنی اصلاح کا جذبہ اُبھرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کی مذکورہ آیت میں جو بات تھی، وہ کوئی قانونی حکم نہ تھا بلکہ وہ صرف ہیمرنگ کی زبان (language of hammering) تھی۔ اِس آیت کا مطلب مجرمین کی اصلاح تھا، نہ کہ مجرمین کا قتل۔ چناں چہ اِن قیدیوں میں سے بیش تر لوگ بعد کو اسلام میں داخل ہو گیے۔ مثال کے طور پر سہیل بن عمرو، وغیرہ۔

2- اِسی طرح قرآن کی ایک آیت یہ ہے: **یٰأیھا النبی جاھد الکفّار و المنافقین واغلظ علیھم** (التوبہ: 73) یعنی اے نبی، منکروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر کڑے بن جاؤ۔ اِس آیت کو لے کر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اِس میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ منکروں اور منافقوں سے جنگ کرے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر نے کبھی بھی وہاں کے منکروں اور منافقوں سے مسلّح اقدام کر کے جنگ نہیں کیا۔ پیغمبر اسلام جب بھی کسی جنگ میں شامل ہوئے تو وہ صرف دفاع کے طور پر، نہ کہ اپنی طرف سے حملے کے طور پر۔ یہ واقعہ اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اِس آیت میں جہاد اور غِلظ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ صرف ہیمرنگ کی زبان (language of hammering) کے طور پر ہیں، نہ کہ کسی قانونی حکم کے طور پر۔ اگر وہ کوئی قانونی حکم ہوتا تو پیغمبر اسلام ضرور اُس پر عمل کرتے ہوئے اُن کے خلاف مسلّح جنگی اقدام کرتے۔

3- قرآن میں ہجرت کے وقت سورہ الکافرون اُتری۔ اُس میں اہلِ مکہ کو ''اے منکرو'' کے

لفظ سے خطاب کیا گیا اور کہا گیا کہ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ مگر واقعات کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ ماننا ہوگا کہ یہ ہیمرنگ کی زبان تھی۔ اگر اِن الفاظ کا مطلب یہ ہوتا کہ اہلِ مکہ کا کفر متحقق ہو چکا ہے، وہ اب خدا کی نظر میں ''کافر'' قرار پا چکے ہیں، اب خدا کے نزدیک ان کے لیے دینِ کفر ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اگر یہ بات ہوتی تو اہلِ مکہ کفر پر جیتے اور کفر پر مرتے، مگر عملاً اِس کے برعکس ہوا۔ اِس کے بعد جو ہُوا وہ یہ تھا کہ اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگ جنگ بدر میں مارے گیے اور جو لوگ بچے، اُن سب نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ اِسی عملی پہلو کو سامنے رکھ کر سورہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورہ الکافرون کے الفاظ ہیمرنگ کی زبان میں تھے، وہ قانونی حکم کی زبان میں نہ تھے۔

قرآن کے اسلوب کے بارے میں یہ بات بے حد اہم ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اِس اصول کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے کہ قرآن ایک دعوتی کتاب ہے۔ قرآن کوئی قانونی کتاب نہیں۔ قرآن میں جہاں بظاہر شدت ہے، وہ دعوتی حکمت کی بنا پر مخاطب کی ذہنی ہیمرنگ کے لیے ہے۔ قرآنی اسلوب کے بارے میں اِس اصولی بات کو سامنے رکھے بغیر قرآن کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

قرآن خدا کی کتاب ہے، جو پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ قرآن ایک مجموعے کی صورت میں نہیں اُترا، بلکہ تیئیس سال کی مدت میں متفرق اَجزاء کی صورت میں وہ اتارا گیا۔ پیغمبر اسلام مکّہ میں تھے۔ جب کہ 610 عیسوی میں قرآن کا پہلا حصہ اترا۔ اس کے بعد برابر اُس کے مختلف حصے آپ اُترتے رہے۔ قرآن کا آخری حصہ آپ پر 632 عیسوی میں اترا، جب کہ آپ مدینہ میں تھے۔ قرآن کا یہ نزول فرشتہ جبریل کے ذریعے ہوتا تھا۔ آخر میں خود فرشتہ جبریل کی تعلیم کے مطابق، قرآن کے مختلف حصوں کو ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کیا گیا۔

قرآن میں کُل 114 سورتیں ہیں، کچھ بڑی سورتیں ہیں اور کچھ چھوٹی سورتیں۔ آیتوں کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ ہزار ہے۔ تلاوت کی ضرورت کے لیے قرآن کو تیس پاروں اور سات منزلوں کی صورت میں تقسیم کیا گیا ہے۔

قرآن ساتویں صدی کے رُبعِ اوّل میں اترا۔ اُس وقت کاغذ وجود میں آچکا تھا۔ یہ کاغذ بعض مخصوص درختوں کے ریشے سے لے کر دستی صنعت کے طور پر بنایا جاتا تھا۔ اُس کو پپائرس (Papyrus) کہا جاتا ہے۔ قرآن کا کوئی حصہ جب بھی اُترتا تو اُس کو اس کاغذ پر لکھ لیا جاتا تھا۔ جس کو عربی زبان میں قِرطاس (الانعام: 7) کہا جاتا ہے۔ اِسی کے ساتھ لوگ قرآن کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتے تھے۔ کیوں کہ اُس وقت قرآن ہی واحد اسلامی لٹریچر تھا۔ قرآن کو نمازوں میں پڑھا جاتا تھا اور دعوہ ورک کے تحت اس کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ اِس طرح قرآن بیک وقت لکھا بھی جاتا رہا اور اِسی کے ساتھ اس کو یاد بھی کیا جاتا رہا۔

پیغمبر اسلام کے آخری زمانے تک قرآن کو محفوظ کرنے کا یہی طریقہ جاری رہا۔ آپ کی وفات 632 عیسوی میں ہوئی، اس کے بعد ابوبکر صدیق اسلام کے پہلے خلیفہ بنے۔ انھوں نے باقاعدہ اہتمام کے تحت، قرآن کا ایک مجلد نسخہ بنایا۔ یہ نسخہ قدیم زمانے کے کاغذ یا قرطاس پر بنایا گیا تھا۔ یہ مجلد قرآن چوکور صورت میں تھا۔ چناں چہ اس کو رَبعہ (square) کہا جاتا تھا۔ اِس طرح قرآن، خلیفۂ اول کے زمانے میں مجلد کتاب کی صورت میں محفوظ ہوگیا۔ تیسرے خلیفہ عثمان بن عفّان کے زمانے میں اِس مجلد قرآن کے مزید نسخے تیار کیے گیے اور اس کو مختلف شہروں میں بھیج دیا گیا۔ یہ نسخے شہر کی جامع مسجدوں میں موجود رہتے تھے۔ لوگ اُن کو پڑھتے بھی تھے اور اُن سے مزید نسخے تیار کرتے تھے۔

کتابتِ قرآن کا یہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ انیسویں صدی میں پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا اور ساتھ ہی کاغذ بھی جدید صنعتی طریقے پر بڑی تعداد میں تیار کیا جانے لگا۔ اِس طرح انیسویں صدی میں قرآن کو باقاعدہ طور پر پرنٹنگ پریس کے ذریعے چھاپنے کا آغاز ہوگیا۔ چھپائی کے طریقوں میں مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ اِسی کے ساتھ قرآن کے مطبوعہ نسخے بھی زیادہ بہتر طور پر تیار ہونے لگے۔ اب قرآن کے مطبوعہ نسخے اتنے زیادہ عام ہوگیے ہیں کہ وہ ہر گھر میں اور ہر مسجد میں اور ہر لائبریری میں اور ہر مارکیٹ میں اِس طرح وافر مقدار میں موجود ہیں کہ ہر انسان قرآن کے چھپے ہوئے خوب صورت نسخے حاصل کرسکتا ہے، خواہ وہ کُرۂ ارض کے کسی بھی مقام پر ہو۔

ویل للمطففین

قرآن کی سورہ نمبر 83 میں ارشاد ہوا ہے: **ویل للمطففین الذین إذا اکتالوا علی الناس یستوفون وإذا کالوھم أو وزنوھم یخسرون** (التطفیف: 3-1) یعنی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔

تطفیف کے معنی ہیں، ناپ اور تول میں کمی کرنا۔ اس آیت میں ناپ اور تول میں کمی سے مراد سادہ طور پر صرف ترازو یا ناپ کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ اس میں تمثیل کی زبان میں ایک انسانی صفت کی حقیقت کو بتایا گیا ہے، وہ یہ کہ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایک معیار سے جانچے اور دوسرے کو کسی اور معیار سے۔ وہ اپنی صرف خوبیاں لے اور دوسرے کی صرف برائیاں۔ اور اس طرح غیر منصفانہ تقابل کے ذریعہ یہ ظاہر کرے کہ وہ صرف اچھا ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرا شخص صرف برا۔

تطفیف کا یہ انداز بہت عام ہے۔ ہر سماج میں لوگ کثرت سے اسی روش پر کاربند ہوتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر سماج کے اندر باہمی خیر خواہی اور حسنِ ظن کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً دو آدمیوں نے مل کر ایک کاروبار کیا۔ اُن میں سے ایک شخص نے دس لاکھ روپیہ کا سرمایہ دیا اور دوسرے شخص نے اپنی محنت اور قابلیت کو کاروبار میں وقف کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد کاروبار بڑھا اور اُس کی مالیت ایک کروڑ روپیہ کے برابر ہوگئی۔

اب تطفیف یہ ہے کہ ابتدائی سرمایہ لگانے والا صرف اپنے سرمایہ کو جانے اور فریق ثانی نے اپنی محنت سے اس ابتدائی سرمایہ پر جو اضافہ کیا ہے اُس کو بھول جائے۔ دوسری طرف محنت کرنے والا فریق صرف اپنی محنت کو دیکھے اور دوسرے پارٹنر نے اپنے سرمایہ کے ذریعہ اُس کو جو بنیاد فراہم کی اُس کو

وہ فراموشی کے خانہ میں ڈال دے۔ اس قسم کی تطفیف دونوں شریکوں کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف منفی جذبات پیدا کرے گی یہاں تک کہ دونوں لڑ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ دونوں ایک دوسرے کے حصہ (contribution) کو یاد رکھیں اور اُس کا کھُلا اعتراف کریں تو دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی عزت اور اہمیت ہوگی۔ ایسی حالت میں اُن کا مشترک کاروبار مسلسل چلتا رہے گا یہاں تک کہ وہ عظیم کامیابی تک پہنچ جائے گا۔

یہی معاملہ گروہی نزاعات کا ہے۔ گروہی نزاعات میں بھی عام طور پر لوگ تطفیف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہر گروہ اپنی طرف کے ظلم کو حذف کر کے دوسرے گروہ کے ظلم کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایک گروہ کے لوگوں نے دوسرے گروہ کے لوگوں پر پتھر برسا کر اُنھیں زخمی کر دیا۔ اُس کے بعد دوسرے گروہ کے لوگ مشتعل ہو گئے اور انھوں نے پتھر کے جواب میں بم کا استعمال کر کے مزید اضافہ کے ساتھ فریق اول کو نقصان پہنچایا۔

اب یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق، معاملے کی یک طرفہ رپورٹنگ کرتے ہیں۔ یعنی ایک فریق یہ کرتا ہے کہ وہ صرف دوسرے فریق کے بموں کا حال بتا کر اُس کو ظالم ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرا فریق یہ کرتا ہے کہ وہ مخالف فریق کی طرف سے آنے والے پتھروں کا ذکر کر کے ظاہر کرتا ہے کہ وہی یک طرفہ طور پر ظالم ہے۔ یہ بلاشبہہ تطفیف ہے۔ اس قسم کی تطفیف جس سماج میں رائج ہو جائے اُس کے معاملات کبھی درست نہ ہوں گے۔ اُس کے لوگوں کے درمیان ہمیشہ نفرت اور ٹکراؤ کا ماحول باقی رہے گا۔ اور نفرت اور ٹکراؤ کے ماحول میں نہ ایک گروہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ دوسرا گروہ۔

اس کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ لوگ انصاف اور غیر جانب داری کا طریقہ اختیار کریں۔ ہر ایک یہ کرے کہ دوسرے کی کوتاہی بتانے کے ساتھ وہ خود اپنی کوتاہی کو بھی بتائے۔ دوسرے کے ظلم کی نشاندہی کے ساتھ وہ اپنے حصہ کے ظلم کا بھی کُھلا اقرار کرے۔ یہی منصفانہ روش ہے اور اسی قسم کی منصفانہ روش سے یہ ہوتا ہے کہ کسی سماج میں اعلیٰ اخلاقی قدریں فروغ پائیں اور وقتی رکاوٹوں کے باوجود سماج کا ترقیاتی سفر مسلسل آگے کی طرف جاری رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے۔

یہود کی حیثیت

قرآن میں یہود کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر لعنت کی اور وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوئے۔ دوسری طرف صحیح البخاری (کتاب الجنائز) میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار دیکھا کہ مدینہ کے ایک راستے سے ایک جنازہ گزر رہا ہے۔ آپ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر آپ اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ کسی نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا: اَلَیْسَتْ نَفْسًا (کیا وہ انسان نہیں):

Was he not a human being?

یہاں یہ سوال ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق، یہودی قابل لعنت ہیں اور دوسری طرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق وہ قابل احترام۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دو مختلف بیانات کے درمیان تطبیق کیا ہے۔ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن میں جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ یعنی یہ اللہ کے اپنے نزدیک یہود کی حیثیت کا بیان ہے اور صحیح البخاری میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا جو عمل بیان ہوا ہے، وہ یہود کی اس انسانی حیثیت کو بتاتا ہے جو موجودہ دنیا میں انھیں انسان کی نسبت سے حاصل ہے۔

یہود یا غیر یہود کا ایک معاملہ وہ ہے جس کا تعلق براہِ راست اللہ سے ہے۔ اس کا عمومی اظہار صرف آخرت میں ہوگا۔ جہاں تک موجودہ دنیا کا تعلق ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے ساتھ وہی اخلاقی اور انسانی برتاؤ رکھیں جو ہر انسان کے لیے مقرر ہے، ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم اخلاقی تعلقات میں یہود اور غیر یہود کے درمیان فرق کریں۔

اس سلسلے میں دوسری بات جو واقعات کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب یہود کی تمام نسلوں کے ساتھ علی الاطلاق طور پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف ان یہودی افراد سے ہے جو اللہ کے علم کے مطابق، قابل لعنت فعل کے مرتکب ہوئے ہوں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یہودی

نسل کے بہت سے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اور بعد کے زمانہ میں بھی۔ یہودی مردوں اور عورتوں کے قبول اسلام کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

جب یہودی نسلوں میں برابر ایسے افراد نکل رہے ہوں جو توبہ کریں اور دین حق کو اپنا دین بنائیں، ایسی حالت میں دعوت کے نقطۂ نظر سے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ ان سے نفرت کرکے انھیں مستقل طور پر اپنے سے دور کردیا جائے۔

قرآن کی سورہ الفاتحہ میں **المغضوب علیھم** کا لفظ آیا ہے۔ عام طور پر اس کی تشریح میں کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں مگر یہ صحیح نہیں، اس میں ایک صفت کا ذکر ہے نہ کہ کسی خاص نسل کا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے ذاتی فعل کی بنا پر مغضوب قرار پاسکتا ہے، یہودی بھی اور غیر یہودی بھی۔ حتی کہ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہوسکتے ہیں جو اپنے فعل کی بنا پر اس کے مستحق قرار پائیں، مگر کسی قوم کی تمام نسلوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاسکتا۔

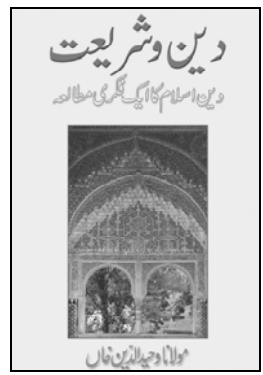

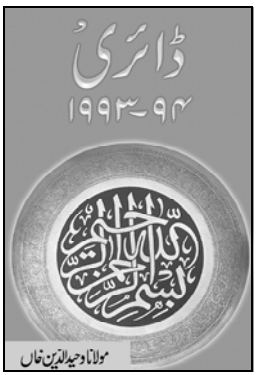

تقابلی طریق مطالعہ

عربی زبان کا ایک بامعنیٰ مثل ہے: تُعرف الاشیاءُ بأضدادھا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اسی بات کو المتنبی (وفات:965) نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے: وبضدھا تتبین الأشیاء ۔ مطالعہ کے اسی فطری اسلوب کو انگریزی ادیب ولیم شیکسپیر (وفات: 1616) نے اس طرح بیان کیا ہے— ہم تقابل کے ذریعہ باتوں کو سمجھتے ہیں:

In comparison that we understand

یہ علمی طریق مطالعہ کا ایک اہم اصول ہے۔ وہ اسلام کے مطالعہ کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا دوسرے علوم کے مطالعہ کے لیے۔ یہاں قرآن اور سنت سے اس معاملے کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم 570ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ 610ء میں آپ کو نبوت عطا کی گئی۔ اس وقت جو ابتدائی احکام قرآن میں اترے، اُن میں سے ایک حکم یہ تھا: وربک فکبر (المدثر: 3) یعنی اپنے رب کی تکبیر کر۔

اب اس آیت کو سمجھنے کے لیے تقابل کا طریقہ استعمال کیجئے۔ اسلام کے دور اول میں جب مکہ میں یہ آیت اُتری اس وقت مشرکین نے توحید کے گھر کعبہ پر قبضہ کر کے وہاں 360 بت رکھ دئے تھے۔ یہ واضح طور پر ایک ناقابلِ برداشت فعل تھا۔ ایسی حالت میں بظاہر یہ حکم اترنا چاہیے تھا کہ: والأصنام فدمّر (بتوں کو توڑ ڈالو) مگر اس وقت قرآن میں تدمیر اصنام کے بجائے تکبیر رب کا حکم نازل ہوا۔

اس تقابل پر غور کیجئے تو ایک نہایت گہری حکمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی تحریک یا دینی دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ افکار میں تبدیلی کی پرامن جدوجہد سے اپنے عمل کا آغاز کیا جائے، نہ کہ نظام یا ظاہری ڈھانچہ کو تشدد کے ذریعہ توڑنے سے۔ اس ربّانی حکمت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے

مصلحین نے نظام کو توڑنے سے اپنے عمل کا آغاز کیا جو قانونِ الٰہی کے خلاف ہونے کی بنا پر اصلاح کے نام پر فساد کا باعث بن گیا۔ یہی وہ ذہن ہے جس کی ترجمانی اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے:

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد　　گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

2۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت کے ابتدائی 13 سال تک مکہ میں رہے۔ اس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ انھوں نے رسول اور اصحابِ رسول کے خلاف طرح طرح کے مسائل پیدا کردئے۔ مثلاً مکہ میں آزادانہ طور پر عبادت کرنا سخت مشکل ہوگیا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری: **إن مع العسر یسرا** (الانشراح: 4) یعنی بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

تقابل کے اصول پر غور کیجیے تو یہاں دوسرا حکم یہ نازل ہوسکتا تھا کہ مشکلات کی چٹان کو توڑو تاکہ تمھارے لیے اسلام پر عمل کرنے کا راستہ ہموار ہوجائے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس تقابلی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکلات سے ٹکرانا اسلام کا طریقہ نہیں، بلکہ مشکلات سے اعراض کرتے ہوئے ممکن دائرہ میں اپنے لیے عمل کے مواقع تلاش کرنا، یہ اسلام کا طریقہ ہے۔ ایک جملہ میں، قرآن کا فارمولا یہ ہے — مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

اس اسلامی حکمت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کے مصلحین نے مسائل کو دیکھتے ہی مسائل کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا کیوں کہ خود ساختہ سوچ کے تحت انھوں نے یہ سمجھا کہ پہلے مسائل سے لڑکر مسائل کا خاتمہ کرو، اس کے بعد ہی ہمارے لیے کام کے مواقع پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہی وہ ذہن ہے جو عرب دنیا کے رہنماؤں کے یہاں اس نعرہ کی شکل میں جاری ہوا: **الجهاد هو الحل الوحيد** (جہاد ہی واحد حل ہے) حالانکہ اگر وہ قرآنی حکمت کو سمجھتے تو ان کا قول برعکس طور پر یہ ہوتا: **الدعوة هي الحل الوحيد** (دعوت ہی واحد حل ہے)۔

3۔ مکہ کے 13 سالہ دور میں اگرچہ سو سے زیادہ آدمی اسلام میں داخل ہوگئے تھے، مگر مشرکین کے غلبہ کی بنیاد پر وہاں رسول اور اصحاب رسول کے لیے حالات دن بدن سخت ہوتے چلے گئے۔ یہاں

تک کہ تیرھویں سال ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ آپ اور آپ کے اصحاب مکہ کو چھوڑ کر مدنیہ چلے گیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رات کے وقت مکہ کو چھوڑا تو صورت حال یہ تھی کہ وہاں کے مشرکین تلوار سے مسلح ہو کر آپ کے مکان کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ گویا ان کی طرف سے ایک قسم کی دعوت قتال تھی۔ مگر آپ مقابلہ سے اعراض کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ رات کے وقت مکہ سے نکلے اور 400 میل کا سفر طے کر کے مدینہ آگیے۔

ہجرت کا یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔ جیسا کہ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: **اُمرتُ بقریةٍ تأکل القرُیٰ یقولون یثرب و ھی المدینة**۔ ہجرت کا یہ واقعہ اسلام کی تاریخ میں اتنا اہم تھا کہ اس سے اسلامی کیلنڈر کا آغاز کیا گیا۔

مگر تقابلی اعتبار سے دیکھیے تو یہاں ایک اور صورت ممکن تھی۔ وہ یہ کہ ہجرت، بالفاظ دیگر مقابلہ کے مقام سے ہٹ جانا، کے بجائے محاصرہ کیے ہوئے مشرکین سے جنگ کی جائے خواہ اس کا نتیجہ جس شکل میں بھی برآمد ہو۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کے اعتبار سے دیکھیے تو اس معاملے میں یہی دوسرا طریقہ زیادہ معیاری تھا۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کی یہی عام سوچ رہی ہے۔ اس ذہن کی ترجمانی سلطان ٹیپو (وفات: 1799) نے میں ان الفاظ میں کی تھی — شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لڑائیاں پیش آئیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ان کے ستر افراد مارے گیے۔ یہ مشرکین کی طرف سے بلاشبہ ایک ظالمانہ واقعہ تھا۔ مگر قرآن میں جب اس پر تبصرہ آیا تو مشرکین کو الزام دینے کے بجائے خود مسلمانوں کو نصیحت کی گئی۔ قرآن میں یہ آیت اتری: **حتی اذافشلتم وتنازعتم فی الامر** (آل عمران:152) یعنی جب تم کمزور پڑ گیے اور معاملے کے بارے میں تمھارے اندر نزاع پیدا ہوگئی۔

تقابلی اعتبار سے دیکھیے تو اس معاملے میں دوسری صورت یہ تھی کہ حملہ آور مشرکین کے خلاف

غصے کا اظہار کیا جاتا، جیسا کہ اس طرح کے معاملات میں مسلم رہنماؤں کا عام طریقہ ہے۔ وہ ایسے مواقع پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔ اور احتجاج کی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ مثلاً بیسویں صدی کے ربع اول میں جب اٹلی کی فوجیں لیبیا میں داخل ہوگئیں تو ایک مشہور عالم نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

كيف القرار وقد نكس أعلامنا بطرابلس

5۔ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کے بعد بھی مشرکین نے اپنی مخالفانہ کارروائیوں کو ختم نہیں کیا۔ اب انھوں نے یکطرفہ جارحیت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر جنگوں کے ذریعے کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اب اللہ تعالیٰ نے الصلح خير (النساء: 128) کے اصول کے مطابق، ایک ایسی تدبیر کا حکم دیا جس کے نتیجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان امن کا معاہدہ طے پا گیا جو اسلام کی تاریخ میں صلح الحدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

صلح حدیبیہ کی تفصیلات حدیث میں اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر دو ہفتہ کی گفت وشنید جاری رہی۔ مگر مشرک سردار اپنی ضد کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی شرطوں کو یکطرفہ طور پر منظور کرتے ہوئے ان سے امن کا معاہدہ کرلیا اور مدینہ واپس آگیے۔

اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد قرآن میں یہ آیت اتری: انا فتحنا لک فتحا مبينا (الفتح : 1) یعنی ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی۔

اب اس معاملے کو تقابلی اصول پر دیکھیے۔ حدیبیہ کی تفصیلات بتاتی ہیں کہ یہ صلح، صلح نامہ کی ظاہری دفعات کے مطابق، بظاہر مشرکین کی جیت کے ہم معنی تھی۔ ایسی حالت میں دوسری بات جو کہی جاسکتی تھی وہ یہ تھی کہ تم لوگوں نے حدیبیہ کے مقام پر جو صلح کی ہے، وہ تو تمھارے لیے شکستِ مبین کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس کے بجائے قرآن میں اس صلح کو فتح مبین کا نام دیا گیا، جیسا کہ حقیقۃً بعد کو پیش آیا۔

اس تقابل پر غور کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ صلح اور جنگ کے معاملے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملے کو عزت اور ذلت کا مسئلہ نہ بنایا جائے بلکہ مستقبل کے امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے۔ حال کی ظاہری پسپائی اگر مستقبل کی فتح بننے والی ہو تو حال کو نظر انداز کرتے ہوئے مستقبل کی بنیاد پر فیصلہ کر لینا چاہیے۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں جب عرب قوموں کا مقابلہ مغربی طاقتوں سے پیش آیا تو انھوں نے برعکس طور پر اپنی قوم کو یہ جنگی نعرہ دیا: موتوا الیوم اعزاء، قبل ان تموتوا أذلاء (آج عزت کے ساتھ مرجاؤ، اس سے پہلے کہ کل تم کو ذلت کے ساتھ مرنا پڑے)۔

تراجم — 'تذکیر القرآن'

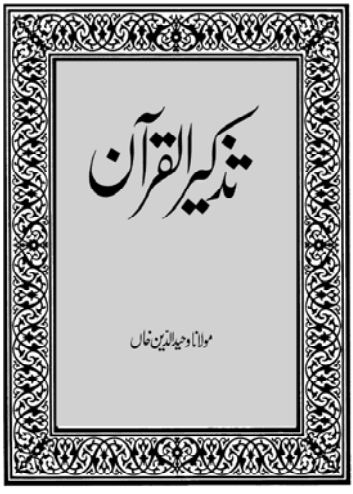

'تذکیر القرآن' کے ہندی اور انگریزی ترجموں کے بعد اب دیگر مقامی زبانوں — تلگو، تامل، آسامی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، بنگالی، اُڑیا، کنڑ، نیز مختلف عالمی زبانوں — جرمن، فرنچ، اسپینش، روسی، جاپانی اور چینی، وغیرہ میں اُس کا ترجمہ اور اشاعت مطلوب ہے۔ جو حضرات 'تذکیر القرآن' کے ترجمہ اور کمپوزنگ اور اشاعت کا دعوتی کام کرنا چاہتے ہوں، وہ ادارے کو اپنا مخلصانہ تعاون دیں، اور اپنے مکمل پتے سے آگاہ فرمائیں۔ اِس سلسلے کے تمام اخراجات ادارے کے ذمّے ہوں گے۔

کتاب، ترازو اور لوہا

قرآن کی سورہ نمبر 57 میں ایک آیت آئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل کی، تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسول کی مدد کرتا ہے بن دیکھے۔ بے شک اللہ طاقت والا، زبردست ہے''۔ (الحدید: 25)

قرآن کی اِس آیت میں بنیادی طور پر تین چیزوں کے اتارنے کا ذکر ہے — نزولِ کتاب، نزولِ میزان، اور نزولِ حدید۔ نزولِ کتاب سے مراد رسولوں کے ذریعے خدائی کلام کو اتارنا ہے۔ نزولِ میزان اور نزولِ حدید میں نزول سے مراد پیدا کرنا ہے، جیسا کہ سورہ الزمر میں فرمایا: **وأنزل لكم من الأنعام ثمانية أزواج** (6)۔ اِس دوسری آیت میں نزولِ اَنعام سے مراد تخلیقِ اَنعام ہے، یعنی مویشیوں کو پیدا کرنا۔ اسی طرح سورہ الحدید میں بھی نزولِ میزان اور نزولِ حدید سے مراد ترازو اور لوہے کو پیدا کرنا ہے۔

خدا نے ہر زمانے میں پیغمبروں کے ذریعے اپنا کلام انسانوں کے پاس بھیجا۔ اب خدا کی آخری کتاب قرآن ہے جو کامل طور پر محفوظ کتاب ہونے کی بنا پر خدائی ہدایت کو معلوم کرنے کا واحد مستند ذریعہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ قرآن کا مطالعہ کرکے اپنے بارے میں خدا کی ہدایت کو معلوم کرے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے۔

اِس نظری ہدایت کے بعد خدا نے دو اور چیز پیدا کی وہ ترازو اور لوہا ہے۔ یہ دونوں چیزیں گویا دو مطلوب ربّانی کردار کے لیے مادّی ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ترازو اِس بات کا ماڈل ہے کہ اخلاق اور معاملات میں آدمی اسی طرح منصفانہ برتاؤ کا طریقہ اختیار کرے جس طرح ایک ترازو برابری کی تول تولتا ہے اور نہایت منصفانہ طور پر حقوق کا تعین کر دیتا ہے۔ ایسا ہی منصفانہ طریقہ انسان

کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کرنا چاہیے۔

یہی معاملہ لوہے کا ہے۔ انسان سے جو ربّانی کردار مطلوب ہے، لوہا اس کا ایک مادّی ماڈل ہے۔ لوہے میں بیک وقت دو اعلیٰ صفت پائی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ قابلِ اعتماد حد تک مضبوط ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے زندگی کے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خدا کی کتاب سے ہدایت معلوم کرے اور اجتماعی زندگی میں لوہے کی طرح مضبوط کردار کا حامل بن جائے۔ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ دوسروں کو اُس سے ہمیشہ فائدہ پہنچتا رہے۔

اِس آیت میں لوہے کی دو صفت بتائی گئی ہے۔ مضبوطی اور نفع بخشی۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے الگ نہیں، بلکہ وہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مضبوطی ہی کا ایک پہلو نفع بخشی ہے۔ کوئی چیز مضبوط ہو، اُسی وقت وہ نفع بخش بن سکتی ہے۔ مضبوطی نہیں تو نفع بخشی بھی نہیں۔

آیت کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ یہ سارا معاملہ حالتِ غیب میں پیش آتا ہے۔ کیوں کہ انسان کو اِس دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے درست رویّہ اختیار کرنا۔ یہ بات حالتِ غیب ہی میں ہوسکتی ہے۔ اگر خدا اور اس کی طاقت آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوجائے تو وہ حالت ہی ختم ہوجائے گی جس میں کسی کا امتحان لیا جائے اور اس کے بارے میں آخرت کے انجام کا فیصلہ کیا جائے۔

لکھنؤ میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں:

Mohammad Hassan Nadwi
Star Mobiles & Electronics, Shop No. 6, Sabzi Mandi,
Sattya Market, Sector: 17, Lucknow. (U.P.) 226 016
Mobile: 09305356090, Email: mhcps@yahoo.com

غیر حقیقی ذہن

ایک سفید فام امریکی نومسلم ہیں اُن کا قدیم نام اسٹیو اسکلر (Steev Sklar) تھا۔ اُنھوں نے اپنا اسلامی نام محمد مصطفیٰ رکھا۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد دس سال سے زیادہ مدت مسلم ملکوں میں گزاری۔ انھوں نے عربی زبان اتنی سیکھ لی ہے کہ اب وہ بے تکلف عربی بولتے ہیں۔ دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق، موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا کیس وہی ہے جس کو انگریزی میں پیرانوئیا (paranoia) کہا جاتا ہے، یعنی اپنی بڑائی کا وہم۔

محمد مصطفیٰ صاحب کئی بار دہلی آئے اور ہر بار مجھ سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی میرے پاس آتے، وہ روزے سے ہوتے۔ ان کا کہنا تھا کہ تنہا آپ کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کا ہر مسلمان میرے نزدیک ایک پیرانوئک کردار (paranoic character) بن گیا ہے۔

پیرانوئیا کا مفہوم تقریباً وہی ہے جس کو ایک فارسی مقولے میں 'پدرم سلطان بود' کہا گیا ہے۔ میں اپنے تجربہ اور مطالعہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں جو نفسیات پیدا ہوئی، وہ عین اسی کے مطابق تھی۔ مسلمانوں میں جب بادشاہت تھی تو اگرچہ بادشاہ صرف ایک ہوتا تھا مگر سارے مسلمان 'پدرم سلطان است' کی نفسیات میں جیتے تھے۔ اور اب جب کہ قدیم طرز کی بادشاہت ختم ہوگئی تو اب سارے مسلمان 'پدرم سلطان بود' کی نفسیات میں جیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت پچھلے تقریباً ہزار سال سے اسی قسم کی نفسیات میں جی رہی ہے۔ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں میں غلط طور پر شاہانہ عظمت، ترقی اور تنزلی کا معیار بن گئی۔ اگر اُنھیں دنیا میں شاہانہ حیثیت حاصل ہو تو وہ اپنے آپ کو عظمت کے پہاڑ پر کھڑا ہوا محسوس کریں گے۔ اور اگر شاہانہ حیثیت ختم ہو جائے تو اُن کا وہی حال ہوگا جس کو اقبال نے

اپنے ایک مصرعہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا!

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا ہونا یا نہ ہونا دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ یہ مومن کا کمال ہے کہ وہ ہر حال میں **ففروا إلى الله** (الذاریات: 50) کا مصداق بنا ہوا ہو۔ وہ ہر حال میں اللہ کی طرف بھاگے۔ دنیا میں پانا اس کو آخرت کی محرومی کی یاد دلائے اور دنیا کی محرومی اُس کے لیے تعلق باللہ میں اضافہ کا سبب بن جائے۔ اُس کو غلبہ حاصل ہو تو وہ آخرت کی باز پُرس کے احساس سے کانپ اُٹھے۔ وہ مغلوب ہو جائے تو اُس کا عجز اُس کو اللہ کی قدرت کی یاد دلائے۔ اُس کو دنیا کی نعمتیں ملیں تو وہ سہم اُٹھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخرت میں اُس سے یہ کہہ دیا جائے کہ — **أذهبتم طيباتكم في حياتكم الدنيا** (الاحقاف: 20) اور اگر دنیا کی نعمتوں میں اس کو حصہ نہ ملے تو وہ کہہ اُٹھے کہ خدایا، اگر تو مجھے آخرت کی نعمتوں سے محروم نہ کرے تو دنیا کی نعمتوں سے محرومی کی مجھے پروا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی پوری زندگی ایک مسلسل امتحان ہے۔ یہاں صاحب اقتدار ہونا بھی امتحان ہے اور بے اقتدار ہونا بھی امتحان۔ یہاں ملنا بھی امتحان ہے اور چھن جانا بھی امتحان۔ یہاں باعظمت ہونا بھی امتحان ہے اور بے عظمت ہونا بھی امتحان۔ اصل قابلِ لحاظ چیز یہ ہے کہ آدمی کو جس آزمائش میں بھی ڈالا جائے اُس میں وہ پورا اُترے۔

سہارن پور (یوپی) میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں۔ یہاں سے دعوتی مقصد کے لیے کتابیں مفت بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ پتہ درج ذیل ہے:

Dr. Mohd. Aslam
3/1108, Dehradun Chowk, Saharanpur-247001, U.P.
Mob. 9997153735, Email: dr_aslm@rediffmail.com

اسکیم برائے ادارہ اور مساجد

مساجد اور مدارس اور اداروں کے لیے مولانا وحید الدین خاں کی دس کتابوں کا ایک منتخب سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ خواہش مند حضرات آرڈر روانہ کرکے ۴۰ فی صد کی خصوصی رعایتی قیمت پر اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمّہ ہوگا۔ نیز یہ آرڈر صرف D.D. یا M.O. کے ذریعے روانہ کیا جائے گا۔ جو حضرات کتابوں کا یہ منتخب سیٹ مساجد اور مدارس اور اداروں کو اپنی طرف سے ہدیہ کرنا چاہتے ہوں، وہ بھی اِس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر آرڈر کے ساتھ ماہ نامہ الرسالہ (اُردو) ایک سال کے لیے مفت جاری کیا جائے گا۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں:

سیٹ برائے مساجد	سیٹ برائے ادارہ اور مدارس
1 تذکیر القرآن (اُردو)	1 تذکیر القرآن (اُردو)
2 اللہ اکبر	2 اللہ اکبر
3 مطالعۂ قرآن	3 مطالعۂ سیرت
4 قال اللہ وقال الرسول	4 الاسلام
5 مطالعۂ حدیث	5 فکر اسلامی
6 مطالعۂ سیرت	6 دین وشریعت
7 سیرتِ رسول	7 تجدید دین
8 پیغمبر انقلاب	8 مذہب اور جدید چیلنج
9 عظمتِ اسلام	9 انسان کی منزل
10 انسان کی منزل	10 رازِ حیات
رعایتی قیمت صرف: -/Rs. 570	رعایتی قیمت صرف: -/Rs. 510

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 24355454, 24355729, email: info@goodwordbooks.com

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 100	$10/£5
دو سال	Rs. 200	$20/£10
تین سال	Rs. 300	$30/£15
پانچ سال	Rs. 480	$45/£20